طلوعِ اسلام

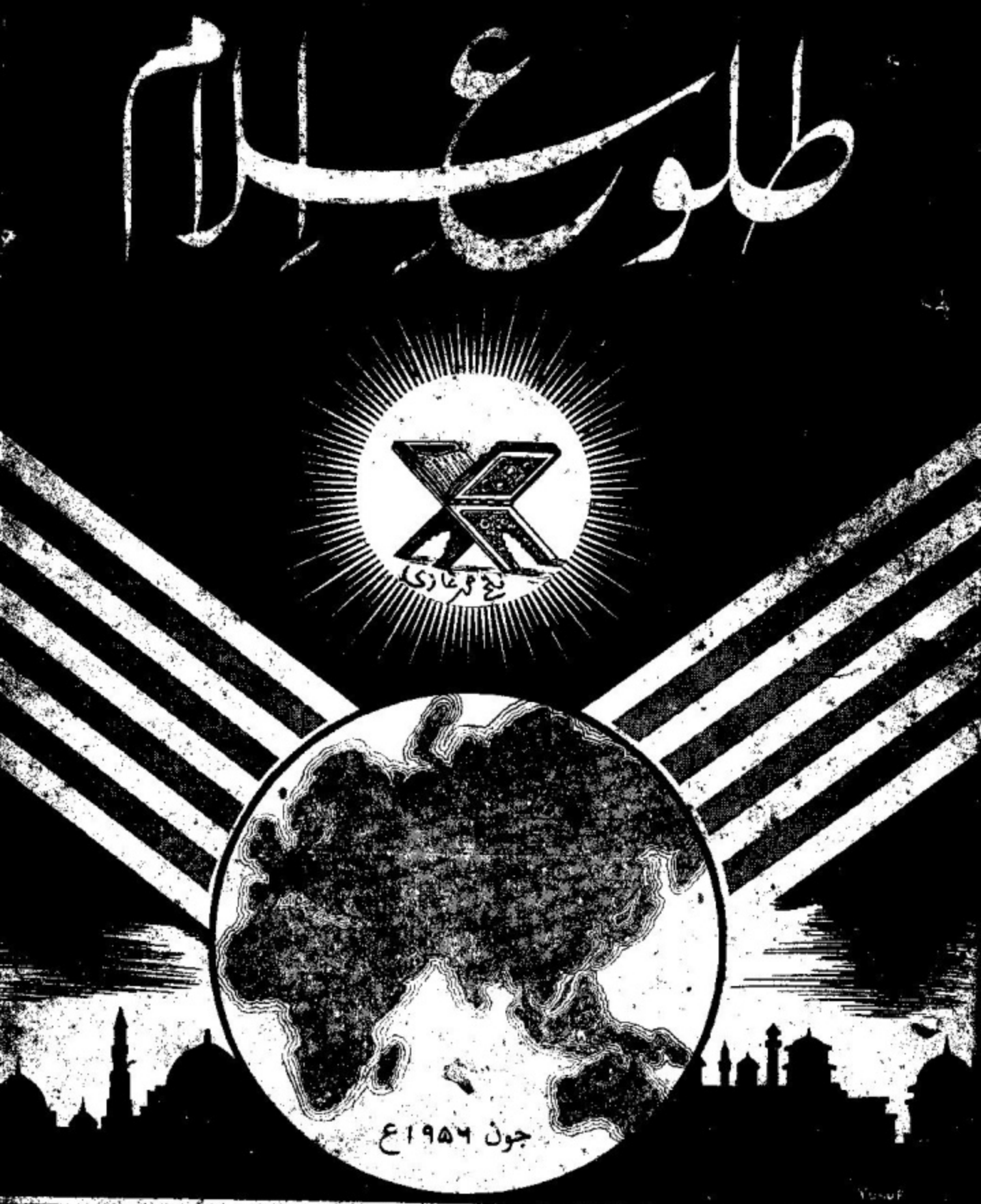

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ
ہندوستان سے بارہ آنے
پاکستان سے بارہ آنے

بدل اشتراک سالانہ
ہندوستان اور پاکستان سے آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۲۰ شلنگ

دفتر کا پتہ
۳/۱۵۹۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی
ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

ٹیلیفون نمبر
۳۱۴۸۸

جلد ۹ | جون ۱۹۵۶ء | نمبر ۵

معاشی مسائل کا قرآنی حل

دوران سفر محترم پرویز صاحب نے عنوان بالا پر جو بصیرت افروز
(ادارہ) راولپنڈی میں جو تقاریر کی تھیں، ان کا ملخص (ایک سلسلۂ نشرت)
کی شکل میں (انشاء اللہ) جون ہی میں شائع ہوگا۔ اس تقریر کی اہمیت کے پیش نظر
پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنے کا بھی خیال ہے تاکہ اس کی اشاعت عام
ہو سکے۔ بزم ہائے طلوع اسلام سے گزارش ہے کہ وہ بہت جلد اطلاع دیں کہ
انہیں کس قدر پمفلٹ مطلوب ہوں گے۔ قیمت اتنی رکھی جائے گی کہ اخراجات
پورا کر سکے۔ ان پمفلٹوں کو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیجئے۔ یہ وقت کے
اہم تقاضے کو پورا کریں گے

فہرست مضامین

لمعات	۲ ——— ۱۰
سلیم کے نام	۱۱ ——— ۲۳
مجلسِ اقبال	۲۴ ——— ۳۶
قرآنی معاشرہ	۳۷ ——— ۵۱
اسلام کی سرگزشت	۵۲ ——— ۶۰
حقائق و عبر	۶۱ ——— ۶۷
باب المراسلات	۶۸ ——— ۶۹
اشتہارات	۷۰ ——— ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان مسلم لیگ کے جائنٹ سکریٹری محترم منظر عالم صاحب نے مسلم لیگ کے منشور کا ایک مسودہ مرتب فرمایا ہے۔ اور اسے ارباب فکر و نظر کے پاس بغرضِ تنقید و تبصرہ بھیجا ہے۔ تاکہ ان تنقیدات کی روشنی میں مسلم لیگ مجلسِ عاملہ اسے آخری ترتیب دے سکے۔ مسلم لیگ (یا ملک کی دوسری پارٹیوں) کے متعلق طلوع اسلام کا نقطۂ نگاہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران میں یہ مسلم لیگ کا سب سے بڑا حامی تھا۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد سب سے پہلے اس نے یہ آواز بلند کی کہ ملک میں پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دے دینا چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے سب سے پہلے خود مسلم لیگ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس نقطۂ نگاہ کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک مسلم لیگ (یا کسی اور پارٹی) کے منشور کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ لیکن چونکہ مسودۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کا مقصود یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ پاکستان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کے قالب میں ڈھالنے، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس صحیفہ کا قرآنی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر ارباب لیگ کو بتا دیا جائے کہ اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ارشاداتِ خداوندی کی رو سے ان کا راہِ عمل کیا ہونی چاہیئے۔

سب سے پہلے ہم اس بنیادی حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ ایک جماعت ہے اور غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی۔ اس جماعت (یا پارٹی) کے اندر مختلف پارٹیوں کا وجود قرآن کی نصوص صریحہ کی رو سے شرک ہے۔ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲)۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے اور رسول اللہؐ سے اس کا کھلا ہوا حکم ہے کہ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیءٍ (۶/۱۵۹)۔ اس باب میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی ملت اسلامیہ میں مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں دونوں کا وجود شرک ہے۔ ہم مسلسل آٹھ برس سے قرآن کے اس فیصلے کو پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور پوری تحدی اور چیلنج کے ساتھ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن آج تک نہ ہمارے مذہبی فرقوں میں سے کسی نے اس کی تردید کی جرأت کی ہے اور نہ ہی سیاسی پارٹیوں میں سے کسی نے اس کا جواب دیا ہے۔ اس کے باوجود سیاسی پارٹیوں میں سے بھی ہر ایک اپنے آپ کو اسلام کا محافظ قرار دے رہی ہے اور مذہبی فرقوں میں سے ہر ایک اپنے آپ کو اسلام کا صحیح نمائندہ ٹھہرا رہا ہے۔ اور اب تو خیر سے جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے آئین نے بھی ان فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا فرما دی ہے۔ چونکہ زیرِ نظر مسودۂ منشور میں بھی قرآن و سنت کو سرعنوان رکھا گیا ہے۔ اس لئے ہم ارباب لیگ سے باادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بتائیں

کہ قرآن کریم کی رو سے مسلم لیگ کا وجود کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ہندوستان میں صورت حالات یہ تھی کہ پورے ملک کے (مسلم و غیر مسلم) باشندے انگریز کے محکوم تھے۔ جب انگریز نے ان باشندگانِ ملک کو آزادی دینے کا ارادہ کیا تو ہندوؤں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ تمام ملک کے باشندے ایک قوم ہیں اس لئے مجوزہ آزادی اس قوم کو ملنی چاہیئے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ بربنائے مذہب ایک الگ قوم کے افراد ہیں اس لئے انہیں جداگانہ مملکت ملنی چاہیئے۔ ہندوؤں کا مطالبہ ایک سیاسی پارٹی (کانگریس) کی طرف سے پیش ہوا تھا اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ بھی ایک پارٹی کی طرف سے پیش ہو اس پارٹی کا نام مسلم لیگ تھا اور اس کا مقصد ہندو کے خلاف مقدمہ لڑنا تھا۔ یہ مقدمہ اس کے جری، بیباک اور دیانتدار وکیل (قائداعظم مرحوم) نے نہایت کامیابی سے لڑا اور مسلمانوں کو ایک جداگانہ مملکت عطا ہو گئی۔ اب نہ کوئی مقدمہ ہے نہ نزاع۔ نہ فریق ثانی (ہندو) موجود ہے نہ جج (انگریز) لیکن فریق اول (مسلم لیگ) ہے کہ اپنے آپ کو بہ حیثیت فریق مقدمہ زندہ و پائندہ رکھنے پر مصر ہے اور اس کے اصرار کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے یہ مقدمہ جیتا تھا (چنانچہ اس مسودۂ منشور میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ وہ جماعت ہے جو حصول پاکستان کی ذمہ دار ہے) آپ سوچئے کہ کیا یہ پوزیشن انتہائی مضحکہ انگیز نہیں؟ خود زیر نظر مسودہ میں یہ مذکور ہے کہ

مسلم لیگ اپنے اس عقیدہ کی توثیق کرتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان ایک ملت ہیں

اور اس ملت کا اپنا جداگانہ ملک ہے۔ اپنی جداگانہ مملکت ہے۔ اپنا جداگانہ آئین ہے۔ اپنی جداگانہ حکومت ہے۔ سوچئے کہ اس کے بعد اس پارٹی کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے جس نے اس ملک اور مملکت کے حصول کی کوشش کی تھی؟ اگر مقصد اس پارٹی کے اس کارنامہ کی یادتازہ رکھنا ہے۔ تو اس کے لئے کوئی یادگار نصب کر دینی چاہیئے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جمہوری انداز حکومت میں پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ پارٹیوں کا وجود مغرب کے جمہوری انداز حکومت میں ضروری ہے یا اسلامی جمہوریت میں بھی؟ آپ اٹھتے بیٹھتے اسلامی جمہوریت اسلامی جمہوریت کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن عملی نظم و نسق کے لئے آپ کے سامنے ہمیشہ مغرب کی جمہوریت رہتی ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جس قرآن نے پارٹیوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے کیا اس قرآن کے تصور جمہوریت میں پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوگا؟ پارٹیوں کے وجود کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوری پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود بھی لابدی ہے۔ ذرا اس مفروضہ کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے (مثلاً) الیکشن میں مسلم لیگ تمام کی تمام نشستوں کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کرتی ہے اور ہر امیدوار کی کامیابی کے لئے سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے۔ اگر پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود ناگزیر ہے تو پھر یہ پارٹی (یا کوئی اور پارٹی) الیکشن میں اپنی اکثریت کے بعد باقی نشستوں کو فریق مقابل کے لئے کیوں نہیں چھوڑ دیتی؟ بات صرف اتنی ہے کہ ہر پارٹی سو فیصدی نشستوں کے حصول کے لئے ان تھک کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کے باوجود اس کی مخالف پارٹی کچھ نشستیں لے جاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اپنی شکست کو نیکی (VIRTUE) بنا کر پیش کرتی ہے کہ پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود بھی تو ضروری ہے! سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی الیکشن میں ایک ہی پارٹی تمام کی تمام نشستیں لے جائے تو پھر جمہوری انداز حکومت چل سکے گا یا نہیں؟ یاد رکھئے۔ نبی اکرم اور خلافت راشدہ میں جو جمہوری پارلیمان بنی تھی۔ اس میں حزب مخالف کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ ملت میں پارٹیوں کا وجود اندیشۂ قرآن شرک ہے۔ رسول اللہ کے زمانے میں نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا نہ سیاسی پارٹی۔ لہٰذا جو علمائے کرام مذہبی فرقوں کے وجود کو اور جو زعمائے ملت سیاسی پارٹیوں کو

(ضرورتی تو ایک طرف) جائز سمجھتے ہیں وہ قرآن اور سنت دونوں کی مخالفت کرتے ہیں اور شرک جلی کے مرتکب ہیں۔ امت اس وقت جس جہنم میں مبتلا ہے (اور صدیوں سے مبتلا چلی آرہی ہے) وہ اس شرک کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمارے اس دعوے کی بنیاد قرآن کی نصوص صریحہ ہیں۔ اگر کسی کو اس سے انکار ہو تو وہ اپنے قرآنی دلائل پیش کرے جنہیں ہم بمسرت طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔

ہم ان ارباب لیگ سے جو اپنے مسلک کی بنیاد فی الواقع قرآن و سنت پر رکھنا چاہتے ہیں درخواست کریں گے کہ وہ اس منشور کی تکمیل سے پہلے اس اساسی نقطہ پر غور کریں کہ قرآن جس چیز کو شرک قرار دیتا ہے وہ کس طرح عین اسلام ہو سکتی ہے؟ (ضمناً یہ چیز بجائے خویش مضحکہ انگیز ہے کہ مسلم لیگ اتنے عرصے سے موجود ہے اور اس کا منشور اب مرتب ہو رہا ہے!) اس تمہید کے بعد آگے بڑھیے۔ زیر نظر منشور کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> پاکستان کے درخشندہ مستقبل پر یقین محکم کی بناء پر مسلم لیگ اس کی ضامن بنے گی کہ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول جس طرح اسلام نے بیان کئے ہیں۔ ہمارے ملک میں نافذ العمل رہیں گے۔ اور ہماری جمہوریہ کے مسلمان باشندے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلام کے اس قالب میں ڈھال لیں جو قرآن و سنت نے متعین کیا ہے۔ نیز یہ کہ بنیادی حقوق انسانیت جن میں منصب و مراتب کی مساوات اور قانونی۔ معاشرتی۔ معاشی اور سیاسی میزان عدل میں یکسانیت۔ اور خیالات۔ اظہار رائے۔ عقیدہ۔ ایمان۔ پرستش اور میل جول کی آزادی شامل ہے بشرطیکہ یہ مملکت کے قوانین اور عام اخلاق کے حدود کے اندر ہو، تمام باشندگان مملکت کو حاصل ہوں۔

یہ تمام امور وہ ہیں جو پاکستان کے اس آئین میں شامل ہیں۔ جو اب منظور ہو کر مملکت کا منشور بن چکا ہے اور جس کا سہرا ابھی مسلم لیگ اپنے سر باندھ رہی ہے (کہ اسی نے ملک کو یہ آئین دیا ہے) سوچئے کہ اس کے بعد اسی مسلم لیگ کا ان امور کو اپنے منشور میں شامل کرنا اس کے سوا اور کیا ہے کہ

دعا یہ مانگو الٰہی ہو عمر خضر دراز !

اس آئین کے بعد کرنے کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے پروگرام بنایا جائے اور اس میں جو جو خامیاں رہ گئی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کا سوال ارباب حکومت اور ارباب لیگ کے لئے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی شکل ہو جسے نہ اگلتے بنے نہ نگلتے۔ چنانچہ یہی کشمکش زیر نظر مسودہ میں بھی جھلک رہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ لیکن اس سے ذرا آگے غیر مسلموں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان کے مسلمان (بر بنائے مذہب) ایک قوم ہیں تو غیر مسلم اس قوم کے افراد کیسے بن سکتے ہیں۔ اور جب پاکستان میں ان کی حیثیت ایک قوم کی نہیں تو وہ قومی اقلیت کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یورپ میں ایک ملک میں بسنے والے تمام باشندے ایک قوم کہلاتے ہیں۔ اس قوم کی جو پارٹی انتخابات کے ذریعے اکثریت میں آجاتی ہے وہ "قومی اکثریت" کہلاتی ہے۔ اور جو اقلیت میں رہ جاتی ہے۔ وہ "قومی اقلیت" بن جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے الیکشن میں صورت حالات اس سے برعکس ہو جائے۔ اور جو پارٹی پہلے اکثریت میں تھی وہ اقلیت میں آجائے۔ لیکن اس سے ان کی قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس پاکستان

میں صورت حالات بالکل مختلف ہے یہاں مسلمان اپنے مذہب کی بنا پر ایک مستقل قوم ہیں۔ اس لئے غیر مسلم اس قوم کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان (اور پاکستان کے باشندے) ہونے کی جہت سے ان غیر مسلموں کی ہر متاعِ عزیز کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی لیکن اس سے وہ ملت اسلامیہ پاکستانیہ کے افراد نہیں بن سکتے۔ مسلم لیگ اس حقیقت کا کھلے بندوں اقرار نہ کرنے کی وجہ سے عجیب گومگو کے عالم میں مبتلا ہے۔ وہ ایک طرف مسلمانانِ پاکستان کو الگ قوم بھی قرار دیتی ہے۔ اور دوسری طرف غیر مسلموں کو "قومی اقلیت" بھی کہہ کر پکارتی ہے۔ ان حضرات کی یہ منکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن کے پالیسی ملک میں عجیب غریب الجھاؤ پیدا کر رہی ہے۔ ان حضرات کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ پر اچھی طرح سے غور و خوض کے بعد اپنے لئے ایک واضح راہ متعین کریں۔ اگر وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کو ایک منفرد اور جداگانہ قوم سمجھتے ہیں تو پھر کوئی غیر مسلم پاکستانی قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا لیکن اگر وہ پاکستان کے غیر مسلم باشندوں کو (بہ بنائے وطنیت) پاکستانی قوم کا فرد سمجھتے ہیں تو یہاں کے مسلمان ایک الگ قوم نہیں بن سکتے اس صورت میں یہاں کے مسلم و غیر مسلم دونوں مل کر متحدہ قومیت تشکیل کریں گے۔ جو اسلامی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ منشور میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہیئے کہ لیگ کے نزدیک پاکستان کے غیر مسلموں کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

یہی کشمکش ذرا آگے چل کر مخلوط اور جداگانہ انتخاب کے مسئلہ پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ منشور میں لکھا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کا ایک جداگانہ قوم ہونا اس کا متقضی ہے کہ یہاں انتخابات جداگانہ ہوں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مملکتِ پاکستان کے آئیڈیالوجی پر مبنی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے نمائندے مسلمان ہوں اور غیر مسلموں کے غیر مسلم۔ یہاں تک بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ غیر مسلم نمائندے (خواہ وہ جداگانہ انتخاب کے مطابق ہی کیوں نہ منتخب ہوں) پاکستان کی مجلس قانون ساز میں ان قوانین کی تدوین میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں جن کی بنیاد خالصتہً آئیڈیالوجی (کتاب و سنت) پر ہے۔ یہ پوزیشن عجیب ہے کہ غیر مسلم کسی مسلم کو اپنا نمائندہ تو نہیں بنا سکتے۔ لیکن غیر مسلم اراکینِ مقننہ مسلمانوں کے لئے قانون سازی کے کام میں برابر حصہ لے سکتے ہیں۔ یا للعجب! یاد رکھیئے یا تو آپ کو سیکولر اسٹیٹ کا داعی بننا چاہیئے۔ اس صورت میں جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ انتخاب مخلوط ہوں گے اور مسلم و غیر مسلم دونوں مل کر ملک کے لئے قانون مرتب کریں گے۔ اور یا مملکت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر رکھنی چاہیئے اس صورت میں کوئی غیر مسلم مملکت کے قوانین سازی کے کام میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ اسلام کی رو سے صحیح صورت یہی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری صورت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ لیگ کو ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ جو باطل میں مشرکت اسلام کی بارگاہ میں کبھی باریاب نہیں ہو سکتی۔

تعلیم کے متعلق منشور میں ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا ہے۔ اس باب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ تعلیم کا موجودہ نظام جس میں مذہبی تعلیم کے لئے دارالعلوم اور دنیاوی تعلیم کے لئے سکول اور کالج مخصوص کئے جاتے ہیں اسلام کی روح کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام درحقیقت اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ بنابریں ملت اسلامیہ کے لئے وہی نظامِ تعلیم اسلامی کہلا سکتا ہے جس میں دینی اور دنیاوی تعلیم یکجا دی جائے۔ دینی تعلیم سے بھی ہمارا مقصود وہ دقیانوسی تعلیم نہیں جس کا شاہکار ہمارا ملا ہے۔ اس سے خدا تک پہنچنا تو درکنار انسان صفِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں مذہبی تعلیم کے سب ادارے بند کر کے سکولوں اور کالجوں میں ایسی تعلیم دی جائے جس سے طالب علم عصرِ رواں کے تقاضوں کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کر سکے۔ اسی کا نام اسلامی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کے لئے ایک خاص نصاب مرتب کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کام وہی فرد یا ادارہ

کرسکتا ہے جو اپنے اندر انقلابی روح لئے ہو۔ جس فرد یا ادارہ کا مقصد عوام کے ووٹوں کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا ہو وہ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کرسکتا۔

عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد ہے

منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آئندہ انتخابات میں امیدوار کے لئے یہ شرط ہونی چاہیئے کہ وہ قرآن کو باترجمہ پڑھ سکے۔ یہ خیال نیک ہے لیکن ہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قرآن کو مروجہ ترجموں (بلکہ تفسیروں) کے ساتھ پڑھ لینے سے قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اگر اس طرح قرآن سمجھ میں آسکتا تو ہمارے "علمائے کرام" سے بڑھ کر قرآن کا سمجھنے والا اور کون ہوسکتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ اور جس چیز کو وہ قرآن کہہ کر پیش کرتے ہیں اس میں قرآن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے تاریخ کے علاوہ اپنے دور کی علمی سطح تک پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ بہرحال اگر انتخابات کے لئے اس قسم کی شرط رکھنا ضروری ہے تو قرآن باترجمہ کے ساتھ یہ بھی لازمی قرار دیا جانے کہ رکنیت کا امیدوار کم از کم گریجویٹ ہو اور رائے دہندہ کم از کم میٹرک۔ ورنہ محض "قرآن باترجمہ" کی شرط کے ساتھ جس قسم کے امیدوار سامنے آئیں گے۔ ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ کی از سر نو تدوین کی جائے۔ یہ خیال مبارک ہے اور وقت کی ضرورت کا مظہر لیکن اس کے لئے مسلم لیگ کو انتظار کس بات کا ہے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک مثل و بے نظیر ضابطۂ زندگی ہے لیکن اس وقت دنیا کی کسی زبان میں کوئی کتاب (یعنی انسانی تصنیف) ایسی نہیں جو اس دعوے کا ثبوت بہم پہنچا سکے۔ ثبوت بہم پہنچانا تو ایک طرف جو اتنا ہی بتا سکے کہ اسلام ہے کیا؟ اگر مسلم لیگ اس قسم کی کوئی کتاب مرتب کرا سکے جسے دنیا کے بلند ترین ارباب فکر و نظر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا جا سکے کہ یہ ہے اسلام جس کی مثل و نظیر کوئی انسانی ذہن پیش نہیں کرسکتا۔ تو اس کا یہ کارنامہ فی الواقعہ اسلام کی خدمت ہوگا۔

اسی سلسلہ میں منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں نوع انسانی کو کس جہنم کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ مسلم لیگ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس جہنم سے نجات کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ اور وہ ہے اسلامک سوشل آرڈر (اسلامی نظام زندگی) جو ان دونوں راستوں میں اعتدال کی راہ پیدا کرتا ہے۔

ہم مسلسل نو برس سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام ایک ایسا معاشرتی اور معاشی نظام عطا کرتا ہے جو نوع انسانی کو سرمایہ داری اور اشتراکی نظاموں سے نجات دلا کر اسے زندگی گمگشتہ کی بازیابی کی صراط مستقیم پر چلا دیتا ہے لیکن یہ نظام ہے کیا؟ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہر اسٹیج اور ہر منبر سے بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوئے۔ زیر نظر منشور میں بھی ان الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان کا عملی مفہوم کچھ نہیں بتایا گیا۔ ہم ارباب لیگ سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہے تو اس کی تفاصیل سے دنیا کو آگاہ کریں تاکہ ہر سمجھنے والا سمجھ سکے کہ ان الفاظ سے آپ کا مفہوم کیا ہے۔ ان الفاظ کو محض سلوگن کے طور پر دہرا دینے سے کام نہیں چل سکتا۔

اس کے بعد منشور کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے "مذہبی اور ثقافتی اصلاحات" اس ضمن میں حسب ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

(۱) اسلامی اقدار کی ترویج اور اسلامی احکام کی تنفیذ کے لئے "وزارت امور مذہبی" کا قیام ضروری ہے

(۲) پاکستانی علماء و مجتہدین کی ایک مجلس کا قیام بھی ضروری ہے جو وزارت امور مذہبیہ کے لئے مشیر کا کام دے سکے۔

(۳) تمام مساجد وزارت امور مذہبی کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ یہ وزارت معقول مشاہرہ پر ائمہ مساجد اور مؤذنوں کا تقرر کرے گی۔

(۴) اسی وزارت کے ماتحت ایک ادارہ اصلاح معاشرہ قائم کیا جائے۔ یہ ادارہ علمائے کرام کی راہنمائی سے مبلغین تیار کرے۔

(۵) مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ زکوٰۃ۔ صدقات۔ فطرہ اور قربانی کی کھالوں کو جمع کرے۔ ان مدات کی آمدنی شرعی احکام کے مطابق صرف کی جائے۔ اوقاف کی آمدنی بھی انہی مدات میں شامل ہوگی۔

ان تجاویز سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ارباب لیگ کے ذہن میں اسلام کا تصور کیا ہے؟ وہی عیسائیت کا عطا کردہ تصور کہ حکومت کی مشینری میں ایک محکمہ امور مذہبی سے متعلق بھی ہونا چاہیئے (اسے ECCLESIASTICAL DEPTT کہا جاتا ہے۔ یعنی حکومت کے باقی محکمے "دنیاوی امور" سے متعلق ہوں گے اور یہ خاص محکمہ مذہبی امور سے متعلق ہوگا۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہوا اور جس کا علمبردار ہمارا ملا ہے۔ اس تصور کی رو سے دین اور دنیا دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ دنیاوی امور "مشیروں" کے سپرد ہوتے ہیں اور دینی امور "علماء اور مجتہدین" کے تسلط میں۔ یہی تصور ہے جو آئین پاکستان میں پیش کیا گیا ہے اور اسی اعادہ زیر نظر منشور میں کیا گیا ہے۔ ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلامی حکومت کا ہر شعبہ اور ہر محکمہ "محکمہ امور مذہبی" کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے دین کی روشنی میں دین کے متعین فرمودہ مقاصد کیلئے کرتا ہے۔ اس نظام حکومت میں "امور مذہبی" امور دنیا سے الگ نہیں ہوتے اس لئے ان امور کے لئے کسی جداگانہ وزارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نظام میں زکوٰۃ۔ صدقات اوقاف مساجد۔ خطبات وغیرہ کا تعلق "مذہب سے" نہیں ہوتا "دنیا" ہی سے ہوتا ہے۔ اس دنیا سے جس کا تمام کاروبار خدا کے قوانین کے تابع سرانجام پاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ چیز بھی بڑی دلچسپ ہے کہ مرتب تو کیا جا رہا ہے مسلم لیگ کا منشور اور اس میں کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ زکوٰۃ و صدقات کو جمع کرے۔ مساجد و اوقاف کا انتظام کرے۔ یتیم خانے کھولے۔ لوگوں کو قرض حسنہ دے وغیرہ وغیرہ۔ غور کیجئے کہ ان دونوں باتوں میں باہمی ربط کیا ہے؟ اگر یہ کہا جاتا کہ جب مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوگی تو وہ یہ کریگی اور وہ یہ کریگی تو یہ بات قابل فہم ہوتی۔ اور ایسا کہنے کی ضرورت بھی اس وقت پیش آتی جب مملکت پاکستان کے آئین میں یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں۔ مملکت کے موجودہ آئین میں یہ سب کچھ موجود ہے لیکن اس کے باوجود لیگ کے منشور میں انہیں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ بجز اس کے کہ ان حضرات کے تحت الشعور میں مسلم لیگ اور مملکت مرادف ہیں۔ اس لئے منشور میں کبھی مسلم لیگ کا نام دے دیا گیا ہے اور کبھی مملکت کا۔

"معاشی پالیسی" کے عنوان سے جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو یورپ کی رفاہی مملکتیں (WELFARE STATES) کہتی ہیں (اور جو وہی راستہ ہے جس کی انتہا کمیونزم ہے) یعنی بڑے بڑے زمینداروں سے زمینیں لے کر کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائیں (منشور میں زمینداروں کو معاوضہ دے کر زمینیں حاصل کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے) اور بڑی بڑی کلیدی صنعتیں (KEY INDUSTRIES) کو حکومت کی تحویل میں دیدیا جائے (یعنی NATIONALISE کر دیا جائے) مزدوروں کے لئے زندگی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور معاشی نظم و نسق میں سود کو ختم کر دیا جائے۔ سب افراد کے لئے مملکت کام کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور گداگری کو یک قلم موقوف کر دیا جائے۔ عاضی بیکاری اور بڑھاپے کی ناداری کے لئے انشورنس کا انتظام کیا جائے۔ مریضوں کے لئے مفت علاج کا بندوبست کیا جائے اور ضروریات زندگی کی قیمتیں ایسی مقرر کی جائیں جو کسی کے دسترس سے باہر نہ ہوں۔ ہر ایک کے

بے سکونتی مکانات مہیا کئے جائیں اور نفع اندوزی اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی حد بندی کی جائے عمال حکومت کو قوم کا خادم سمجھا جائے اور تمام امور کے فیصلے غیر معمولی تاخیر کئے بغیر کئے جائیں، سرکاری تقریبات سے اسراف بیجا کو ختم کر دیا جائے، اور نمائندگان حکومت کو سادہ زندگی بسر کرنے کا عادی بنایا جائے، وغیرہ وغیرہ اس ضمن میں دو باتیں غور طلب ہیں ایک تو یہ اگر اسلام کا معاشی نظام یہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو اس میں وہ کونسی بات ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ وہی باتیں ہیں جو یورپ کی عام رفاہی مملکتوں (WELFARE STATES) میں اس وقت رائج ہیں اور کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ انکی انتہائی اور مکمل شکل کمیونزم میں ملتی ہے اگر اسلامی نظام بھی یہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام میں اور یورپ کی رفاہی مملکتوں کے نظام میں کیا فرق ہے؟ کیا ہم سمجھ لیں کہ یورپ کی رفاہی مملکتوں کا نظام اسلامی نظام ہے؟ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو زیر نظر منشور میں اسکی وضاحت ہونی چاہیئے تھی چونکہ منشور میں دعوے یہ کیا گیا ہے کہ اسلامی نظام سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم میں اعتدال پیدا کرتا ہے اس لئے یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ

(۱) سرمایہ دارانہ نظام کسے کہتے ہیں اور وہ آج کن ممالک میں رائج ہے

(۲) کمیونزم کا نظام کیا ہے

(۳) اسلامی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح (۱) نظام سرمایہ داری (ب) کمیونزم اور (ج) رفاہی مملکتوں کے نظام سے مختلف اور بہتر ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد بیشتر وقت ایسا گذرا ہے جسمیں مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی مسلم لیگ کی وزارت رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسلم لیگ کا نصب العین وہی ہے جو زیر نظر منشور میں بیان کیا گیا ہے تو وہ اس نصب العین کو عمل میں کیوں نہیں لائی؟ باقی پارٹیاں تو کہہ سکتی ہیں کہ ہمیں اپنے منشور کو عمل میں لانے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن مسلم لیگ تو یہ کہہ نہیں سکتی۔ انکی تو اپنی حکومت تھی، اب بھی جس جس مقام پر لیگی حضرات برسر اقتدار ہیں لیگ ان سے وہ باتیں کیوں نہیں منواتی جن کا ذکر اس منشور میں کیا گیا ہے؟ مثلاً منشور میں کہا گیا ہے کہ عمال حکومت کی تنخواہوں میں حد بندی کی جائے اور انھیں مسرفانہ زندگی بسر کرنے سے روکا جائے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں لیگ لیگی وزراء اور دیگر اہل مناصب سے ہر وقت منوا سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ لیگ نے اس نو سال کے عرصہ میں ایسا کیوں نہیں کیا؟ اگر کہا جائے کہ یہ باتیں اس منشور میں شامل کی گئی ہیں جو مستقبل کے لئے مرتب کیا جارہا ہے تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت تک لیگ کا منشور کیا تھا؟ کیا اس منشور میں اس قسم کی کوئی بات درج نہ تھی۔؟

منشور کے باقی حصہ میں مہاجرین کی آبادکاری، آزادانہ انتخابات، عدلیہ کی آزادی، مشرق و مغربی پاکستان میں مواخات پیدا کرنے کی مساعی، حقوق نسواں کا تحفظ، خارجی پالیسی، کشمیر، جوناگڑھ، مانادور کی بازیابی وغیرہ مسائل کے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور اس باب میں وہی کچھ کہا گیا ہے جو ارباب لیگ اپنے بیانات اور تقاریر میں اکثر و بیشتر دہراتے رہتے ہیں۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ہونا وہی کچھ چاہیئے جو کچھ یہ حضرات قوم سے کہتے رہتے ہیں اور جس کا اعادہ اب اس منشور میں کیا گیا ہے۔ لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمن میں لیگ اور اس کی حکومتوں نے اب تک کیا کیا ہے؟ اگر کچھ نہیں کیا تو انہی امور کو ایک جدید منشور میں شامل کر لینے سے کیا ہوگا؟ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں منشور میں کوئی ایسی بات نہیں جسے لیگی حضرات اس سے پہلے سینکڑوں بار دہرا نہ چکے ہوں لیکن منشور میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اس سے پہلے لیگ میں کیا کمی تھی جسکی وجہ سے یہ امور عمل میں نہ لائے جاسکے اور اب اس منشور کے اختیار کر لینے سے وہ کونسی بات پیدا ہو جائیگی جس سے یہ سب کچھ عمل میں آجائیگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ زیر نظر مسودۂ منشور بڑے سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے (اور اس کے

لئے اس کے مرتب، محترم منظر عالم صاحب سزاوارِ تحسین ہیں) لیکن اس دعوے کے باوجود کہ ہمارا پروگرام محض تخیلاتی تصورات پر مبنی نہیں، یہ محض خوش آئند تصورات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان حسین تمناؤں اور تابناک آرزوؤں کو عمل میں لانے کیلئے لیگ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ مسلم لیگ اپنی ہشت سالہ کوششوں کے بعد، ملک کو ایک آئین دینے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس آئین کے متعلق مسلم لیگ نے ملک کو بتایا ہے کہ وہ اسلامی آئین ہے جس میں ہماری تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ مسلم لیگ اپنے اس معرکہ آرا کارنامہ پر پھولی نہیں سماتی۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی اس آئین کی روشنائی بھی خشک نہیں ہونے پائی کہ اس مسلم لیگ کی طرف سے ایک مبسوط منشور شائع ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ اس منشور میں کہا گیا ہے، وہ سب کچھ اس اسلامی آئین میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو پھر اس منشور کی ضرورت کیا ہے۔ اس صورت میں لیگ کو کہنا صرف یہ چاہیئے کہ ہم نے ملک کو یہ آئین دیا ہے۔ اس کے بعد لیگ کا پروگرام یہ ہے کہ اس آئین کو کامیاب بنانے کے لئے عملی اقدامات کرے اور اس میں عملی تجربہ سے جو نقائص سامنے آئیں انہیں آئینی طریق سے رفع کرنے کی کوشش کرے (چنانچہ منشور میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ اس آئین میں ان ترمیمات کے لئے آئینی کوشش کریگی۔ جن کی ضرورت عملی تجارب سے سامنے آئے گی) اور اگر اس آئین میں یہ کچھ موجود نہیں جو اس منشور میں کہا گیا ہے۔ تو پھر ایسے آئین کو اسلامی کیوں کہا جا رہا ہے؟ اسے لیگ اپنا عدیم النظیر کارنامہ کیوں قرار دے رہی ہے؟

منشور کے آخر میں لکھا ہے کہ

ہمارا پروگرام تخیلاتی تصورات پر مبنی نہیں بلکہ ان اصولوں پر مبنی ہے جو ہم نے تحریکِ آزادی کے دوران میں سیکھے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری تحریکِ آزادی نہایت بلند اصولوں کے دعاوی پر مبنی تھی لیکن معاف فرمائیے، ہم نے اس تحریک سے جو کچھ سیکھا ہے۔ وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کا ذکر فخر و مباہات سے کیا جائے جو کچھ ہم نے سیکھا ہے اس کا مظاہرہ نو برس سے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس مظاہرہ میں اگرچہ کوئی پارٹی بھی مستثنےٰ نہیں لیکن مسلم لیگ اس میں سب سے پیش پیش رہی ہے اس لئے کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار تھا۔ مسلم لیگ کی ساری کوششیں اسی میں صرف ہوتی رہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کی پارٹی مضبوط رہے اور اقتدار کی باگ اس کے ہاتھوں سے نہ نکلنے پائے۔ اس کیلئے اس نے جائز و ناجائز ہر قسم کے حربے استعمال کئے اصول فروشیاں کیں۔ اس نے انتخابات کے وقت (مذہبی فرقوں کی طرح) صرف اپنے آپ کو حق پر اور باقی پارٹیوں کو باطل پرست قرار دیا لیکن پھر تشکیل حکومت کے لئے انہی باطل پرست اور تخریبی پارٹیوں کے ساتھ مفاہمت (COMPROMISE) بھی کی۔ ارباب لیگ میں سے قریب قریب ہر ایک کے کارنامے ملک کے سامنے ہیں۔ اسلامی اقدار تو خیر بہت بلند چیز ہے۔ ان کے سامنے قومی مفاد بھی نہ رہا۔ ان کے پیش نظر ذاتی مفاد رہا اور زیادہ سے زیادہ صوبائی مفاد۔ آخر میں اس نے آئین سازی کے سلسلہ میں ان رجعت پسند مذہبی عناصر سے مفاہمت کی ہے جن کی تاریخ وطنِ تخریبی کارروائیوں کے اور کچھ پیش نہیں کر سکتی۔ اور یہ کچھ محض اس لئے کیا ہے کہ یہ پارٹی عوام میں مقبول رہے۔ اور ملاؤں کی تائید سے الیکشن جیت سکے۔ کیا یہی ہیں وہ زریں اصول جو ہم نے تحریکِ آزادی کے دوران میں سیکھے تھے؟ اگر یہ ٹھیک ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو مسلم لیگ ذرا اس شجرۃ الزقوم پر نگاہ ڈالے جو اس کی مساعی کا نتیجہ ہے اور جس کے پھل ملک میں چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مفلسی۔ ناداری۔ بھوک۔ قحط۔ تباہی۔ بربادی۔ پریشاں حالی۔ بے سروسامانی۔ خوف۔ حزن۔ مایوسی۔ ناامیدی۔ تشتت و انتشار۔ دہشت انگیزی۔ نفع اندوزی۔ سرمایہ پرستی۔ بددیانتی۔ اقربا نوازی۔ اعزہ پروری۔ خود غرضی۔ نفس پرستی۔ ایمان فروشی۔ لوٹ کھسوٹ۔ اس کے ساتھ ہی بے حیائی۔ فحش کاری

بے غیرتی بے حمیتی۔ سوچئے کہ جس درخت کے یہ پھل ہیں اس کی بیماری کس کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ ہمیں تسلیم ہے کہ اس درخت کی بیماری میں ملک کی ہر پارٹی کا حصہ بسدی ہاتھ ہے لیکن ہم اس وقت مسلم لیگ کو اس لئے نمایاں طور پر سامنے لا رہے ہیں کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ قائدِ اعظم کے ترکہ کی وارث، اسلام کی نمائندہ اور اس تحریک آزادی کی علمبردار ہے جو بلند ترین اصولوں پر اٹھائی گئی تھی۔ اور جو نے اس مقدس سرمایہ کی بنا پر قوم سے مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں اس کو اپنی نمائندہ جماعت سمجھے (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) یہ شجرۃ الزقوم پارٹی بازی کا فطری نتیجہ ہے جسے قرآن نے شرک سے تعبیر کیا ہے۔ جس قوم میں قومی شعور بیدار ہو چکا ہو وہ اپنے قومی مفاد کا تحفظ کرتی ہے لیکن بین الاقوامی معاملات میں، ہر قسم کی بد دیانتی کرتی ہے اور جس قوم میں قومی شعور بیدار نہ ہو وہ خود اپنے قومی معاملات میں بھی کچھ کرتی ہے یعنی بین الاقوامی رزمگاہ میں مختلف قومیں پارٹیوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جن کی باہمی تراش انسانیت کے لئے جہنم تیار کرتی ہے اور قومی اکھاڑوں میں مختلف پارٹیاں باہمی کشمکش سے اس جہنم کے لئے ایندھن فراہم کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا جو ابتری ہمارے ہاں پھیل رہی ہے وہ پارٹی بازی کا فطری نتیجہ ہے اور چونکہ مسلم لیگ حکمران پارٹی ہے۔ اس لئے وہ اس ابتری کے لئے برابر کی ذمہ دار ہے۔ بلکہ اس جہت سے کہ وہ سب سے پہلی پارٹی ہے اور برسر اقتدار بھی ہے۔ باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں زیادہ ذمہ دار۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ملک کی فلاح پارٹی کے اصولوں پر منشور مرتب کرنے میں نہیں بلکہ ملک سے پارٹی بازی کی لعنت کو دور کرنے میں ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ملک سے پارٹیوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے اور چونکہ مسلم لیگ اس باب میں بزرگ خاندان کی سی حیثیت رکھتی ہے اسلئے اس معاملہ میں یہ سبقت کرے

(۲) آئندہ الیکشن پارٹیوں کے لیبل کے بجائے ملی سطح پر کئے جائیں۔ یعنی پوری کی پوری ملت پاکستانیہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے بہترین افراد کو اپنا ترجمان منتخب کرے

(۳) اس وقت حالت یہ ہے کہ ہماری سیاست ایک مخصوص گروہ کا اجارہ بن کر رہ گئی ہے۔ وہی سو پچاس افراد ہیں جنھیں ایک دروازے سے نکالئے تو وہ دوسرے دروازے سے اندر آجاتے ہیں۔ فرق صرف لیبل کا ہوتا ہے افراد وہی رہتے ہیں ان افراد کو آزما آزما کر ملت تنگ آچکی ہے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے علاوہ ہمارے پاس اور آدمی ہی نہیں قوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ملک کو اس مایوسی سے نکالنے کا طریق صرف یہ ہے کہ ان افراد کو آئندہ الیکشن میں کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جائے اور اسطرح اس عنصر کو اوپر لایا جائے، جو سیرت اور صلاحیت کے اعتبار سے موجودہ افراد سے کہیں بہتر ہے لیکن جو اس لئے اوپر نہیں آسکا کہ ان حضرات نے قصرِ سیاست کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے۔ جب تک یہ حصار نہیں ٹوٹے گا صحت مند عنصر کبھی برسرِ کار نہیں آسکے گا۔

(۴) کابینت کے امیدوار کے لئے کم گریجویٹ ہونے کی شرط عائد کیجائے۔ اور ووٹر کے لئے کم از کم میٹرک کی۔ امیدوار سے اس امر کا اقرار نامہ لیا جائے کہ وہ تمام معاملات کا فیصلہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کریگا۔ قرآنی اصول کوئی تو انہیں جن سے ڈرا جائے یا جو سمجھ ہی میں نہ آسکیں۔

(۵) جب تک ملک میں موجود طبقاتی تفریق موجود ہے۔ نمائندگی کے حلقے (CONSTITUENCIES) آبادی کے اعتبار سے متعین کئے جائیں۔ یعنی غریبوں کے نمائندے غریبوں ہی سے ہوں اور امیروں کے نمائندے ان کے طبقے سے۔ اور ان کی نشستوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہو۔

(۶) ایوان میں کوئی حزب مخالف نہ ہو اور ہر معاملہ کا آزادانہ فیصلہ کیا جائے۔

(۷) مملکت کے بنیادی فرائض میں یہ داخل کیا جائے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ان کی صلاحیتوں کی

(باقی صفحہ پر دیکھئے)

سلیم کے نام

(اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ)

عزیزم سلیم میاں! تمہارا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں اتنے عرصہ تک تمہیں خط تک نہ لکھوں۔ لیکن غور کرو تو خود ہی چیز تمہاری شکایت کا جواب بھی ہے۔ حالات کچھ ایسے ہی تھے ناں جنہوں نے مجھے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ میں تمہیں خط ہی لکھ سکتا!

نہ آسماں بگردش و مادر میانہ ایم غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

لیکن اتنے لمبے عرصہ تک خط نہ لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا تھا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تمہارے اور طاہرہ دونوں کے کئی ایک جواب طلب خطوط میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے غیر ضروری امور کو چھوڑ کر باقی استفسارات کے متعلق کوشش کروں گا کہ ایک ایک کر کے جواب لکھتا جاؤں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہارا سوال تو دو ایک فقروں میں ختم ہو جاتا ہے اور مجھے جواب میں صفحوں کے صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے!

دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

تمہارا سوال یہ ہے کہ اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ کیا ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے ملک میں آئین سازی کے سلسلہ میں ایسی فضا پیدا ہو چکی ہے۔ جس میں اس قسم کے سوالات رہ رہ کر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ مملکت کا آئین اب منظور ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد قانون سازی کے مراحل شروع ہوں گے۔ اس لئے اس سوال کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات اہم ہے اس لئے ذرا توجہ سے سنو۔

تم جس سے یہ سوال پوچھو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ چار ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس۔ ان عناصر اربعہ نے ایسے مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ جس پر کسی غور و فکر کی ضرورت اور بحث و نظر کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی لیکن

تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں ان امور پر بھی غور و فکر کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی ان میں تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہوں جو عام طور پر بطور مسلمات مانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ میرے نزدیک کسی بات کے صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے غور و فکر کے بعد صحیح مانے۔ قرآن نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا کہ مومن وہ ہیں کہ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ جب قرآن کی خود اپنی آیات کے متعلق یہ تاکید ہے تو عام مسلمات کے متعلق اس کی روش ظاہر ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ ان اصطلاحات کا مروجہ مفہوم کیا ہے؟ واضح رہے کہ یہ موضوع یکسر فنی اور اصطلاحی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں فنی اصطلاحات میں الجھائے بغیر، عام فہم الفاظ میں بات سمجھا دوں۔

قیاس

پہلے قیاس کو لو۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسلام دور دراز ملکوں تک پہنچا اور مسلمانوں کا ربط و ضبط مختلف اقوام سے ہوا تو اس قسم کے معاملات سامنے آئے جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی تفصیلی حکم موجود تھا، اور نہ ہی احادیث میں ایسا حکم ملتا تھا۔ اس لئے فقہاء نے عقل اور رائے سے کام لے کر قرآن اور حدیث کے ملتے جلتے احکام سے زیرِ نظر معاملات کے متعلق نئے احکام مستنبط کئے۔ اس کا نام قیاس ہے۔ یعنی ایک بات سے دوسری بات کا اندازہ کرنا۔ انگریزی میں اسے (ANALOGICAL REASONING) کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن کی رو سے خمر (شراب) ممنوع ہے۔ لیکن بھنگ کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالصراحت کوئی حکم نہیں ملتا۔ اب ایک فقیہ جو قیاس سے کام لے گا، وہ یہ دیکھے گا کہ شراب اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے۔ لہذا اگر بھنگ میں نشہ ہو تو وہ بھی ممنوع ہے۔ اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ ہر نشہ آور شے ممنوع ہے۔ اس طرح استنباطِ مسائل کو اجتہاد بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی کوشش کرنا (TO EXERT) ہیں۔

قیاس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اسے بالکل ناجائز قرار دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے، جس میں ہر بات کا حکم موجود ہے۔ لہذا شریعت کے معاملات میں قرآن نے قیاس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ متقدمین میں ظاہری فرقے کے مسلمان اسی خیال کے تھے۔ اور متاخرین میں پنجاب کے فرقہ اہلِ قرآن نے اسی مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ ظاہری مسلک عالمگیر ہوا۔ اور نہ ہی اہلِ قرآن کا فرقہ آگے بڑھ سکا۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی تصور خود منشائے قرآنی کے خلاف تھا۔ اسی خیال کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ تنہا قرآن نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان میں تمام معاملات کے احکام مل جاتے ہیں، اور کوئی بات ایسی نہیں رہ جاتی جس کے لئے کسی نئے فیصلہ کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ تمہیں یاد ہوگا کہ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں محترم ابوالحسنات صاحب نے یہی کہا تھا کہ اسلام میں ہر معاملہ کے متعلق پہلے سے احکام موجود ہیں۔ اس لئے اس میں قانون سازی کی گنجائش ہی نہیں۔

جو لوگ قیاس کے حق میں ہیں وہ قرآن اور حدیث دونوں سے اپنے مسلک کی تائید پیش کرتے ہیں۔ البتہ ان میں اس باب میں اختلاف ہے کہ قیاس کی کہاں ضرورت پڑتی ہے۔ اور وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ حدیث خواہ

ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اسے قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ لہٰذا ان کے نزدیک قیاس کے ذریعہ اجتہاد کی وسعت بہت محدود ہے۔ ان کے برعکس، دوسرا گروہ (جنہیں اہل الرائے کہا جاتا ہے اور جن کے سرخیل امام ابوحنیفہؒ ہیں) قیاس کو بڑی وسعت دیتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی فقہ مرتب کرتے وقت، احادیث سے بہت کم مدد لی ہے۔ اتنی کم کہ ان کے ہاں سترہ اٹھارہ حدیثوں سے زیادہ ملتی ہی نہیں وہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے۔ اور اسی کی روشنی میں نئے نئے معاملات کے متعلق استنباط احکام کیا کرتے تھے۔ اہل حدیث اور اہل الرائے حضرات میں یہی بنیادی وجہ اختلاف ہے۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے (اور کوفہ عراق میں ہے) اس لئے ان کے مسلک کو اہل عراق کا مذہب بھی کہتے ہیں (مذہب کے معنی (RELIGION) نہیں بلکہ (SCHOOL) کے ہیں)۔ اہل حدیث اور اہل الرائے کے اس بنیادی اختلافات کے علاوہ خود اہل الرائے (اہل فقہ) کے مختلف مذاہب فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے ائمہ کے قیاس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہارٹن ((HORTON)) کی تحقیق کے مطابق نویں اور بارھویں صدی عیسوی کے دوران میں، مسلمانوں میں کم و بیش ایک سو فقہی مذاہب پیدا ہو چکے تھے۔ اور علامہ اقبالؒ کی تصریح کے مطابق پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی تک قریب انیس فقہی مذاہب وجود میں آ چکے تھے۔

لیکن تم یہ سنکر حیران ہو گے کہ یہی اہل الرائے اور اہل قیاس حضرات، جنہوں نے اہل حدیث حضرات سے اس بنیادی نقطہ پر اختلاف کیا تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے نت نئے مسائل (PROBLEMS) سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے فکر اور قیاس ہی سے احکامات مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اجتہاد ناگزیر ہے۔ خود کچھ عرصہ کے بعد اس عقیدہ کے ہو گئے کہ اب آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جو کچھ سوچا جانا تھا سوچا جا چکا۔ جتنا کچھ قیاس کیا جانا تھا کیا جا چکا۔ اب آنیوالی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی پابندی لازمی ہے جو ان کے ائمہ اسلاف کر چکے ہیں۔ وہ ان سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتے۔ تم نے سلیم! اپنے ہاں 'مقلد اور غیر مقلد' کی بحثیں سنی ہوں گی۔ ان کے مناظرے دیکھے ہوں گے۔ مقلد یہی لوگ کہلاتے ہیں جو ائمہ اسلاف کے فیصلوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ غیر مقلد وہ ہوں گے جو اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ تو ان میں سے کوئی بھی کھلا نہیں سمجھتا۔ یہ مقلد اور غیر مقلد ــــ مقلد وہ ہیں جو ائمہ فقہ کے فیصلوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور غیر مقلد وہ جو حدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ اجتہاد کا سوال نہ ان کے ہاں ہے نہ ان کے ہاں۔ یعنی اس اعتبار سے دونوں کا مقام ایک ہی ہے۔ دونوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو فیصلے ہو لئے تھے ہو چکے۔ اب قیامت تک آنیوالی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی اتباع لازمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان مقلدین میں بھی مختلف گروہ ہیں بعض صرف مطلق اجتہاد کے بند ہونے کے قائل ہیں، اور بعض ہر نوع تقلید کے قائل۔ لیکن یہ فنی اور فروعی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

تم یقیناً اس مقام پر پوچھو گے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے والوں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیوں کر دیا؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ لیکن سب سے بڑی (اور یوں سمجھو کہ آخری) وجہ زوالِ بغداد تھا۔ ملت اسلامیہ کا دینی مرکز تو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ بغداد کی

تباہی کے بعد (جو تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی) ان کی سیاسی مرکزیت بھی تباہ ہو گئی تھی۔ اور امت میں ہر طرف انتشار ہی انتشار پھیل گیا تھا۔ ان حالات میں (علامہ اقبال کے الفاظ میں)

> امت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ قدامت پسند مفکرین نے یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے۔ اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے، سب پر انہی کی پابندی لازم قرار دیدی جائے اور نئے فیصلوں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ یعنی ان کے پیش نظر ملت کا معاشرتی نظم تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے (خطبات صفحہ ۱۴۴-۱۴۳)

اس وقت کے ارباب شریعت کے پیش نظر یہی مصلحت ہوگی لیکن تم نے غور کیا سلیم! کہ اس وقتی مصلحت نے اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر مستقل نقصان پہنچایا ہے؟ انہوں نے فکر کا دروازہ بند کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ امت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی۔ اور اسلام جو ایک حرکت (MOVEMENT) کا نام تھا منجمد اور متحجر (FOSSILISED) رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ علامہ اقبال مندرجہ بالا اقتباس کے متصل ہی لکھتے ہیں۔

> (اس وقت کے ارباب شریعت نے اس مصلحت کو تو پیش نظر رکھا) لیکن انہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور نہ ہی اسے ہمارے موجودہ علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے! قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔

سلیم! ان الفاظ کو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے نہ بڑھ جانا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے حضرت علامہ چند الفاظ میں بیان کر گئے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تم خود اپنے زمانے کی ان مذہبی جماعتوں پر غور کرو جو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا دعوےٰ لے کر اٹھتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ

(۱) ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اسلاف کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے۔ ہماری ترقی کا راز اتباع سلف میں ہے۔ اور

(۲) اگر کوئی شخص قوم کو غور و تفکر کی دعوت دیتا ہے تو ان کی طرف سے فوراً یہ آواز بلند ہو جاتی ہے کہ اس

فتنہ کو کچل دو۔ یہ امت میں انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک نیا اسلام ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

یعنی وہ اپنے جماعتی نظم کو اسلاف کے نام کی غلط تقدیس اور ان کے مسلک کی متشدد تقلید کے زور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تم اس قسم کے جماعتی نظم پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمہیں نظر آجائے گا کہ اس میں افراد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے قائدین کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے۔ اور ان کے کسی فیصلے پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ وہ اپنے جماعتی تعصب کو مذہب سے والہانہ شیفتگی سمجھتے ہیں۔ اور اس مقدس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارے اس جہاد سے ملت کو عروج اور اسلام کو ترقی نصیب ہوگی۔ یہ وہ رجحان تھا جو زوال بغداد کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک بدستور چلا جا رہا ہے۔ بلکہ پاکستان میں بدقسمتی سے اسے اور بھی شدت کے ساتھ ابھارا جا رہا ہے۔ اسی کو علامہ اقبال نے "جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور، ماضی کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء" قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

> جیسا کہ دور حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے۔ "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں۔ ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو"۔ لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا موثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں بخود خزیدہ (SELF-CONCENTRATED) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیار زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا نہ جائے۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ (ص ۱۴۹)

تم نے دیکھا سلیم! کہ اتنے بڑے اہم مسئلہ کو حضرت علامہؒ نے چند الفاظ میں کس حسن و خوبصورتی سے حل کر دیا ہے! یہی وجہ ہے کہ میں بار بار اس پر زور دیتا چلا آرہا ہوں کہ تم "خطبات اقبال" کا گہری نظر سے مطالعہ کرو۔ لیکن تمہیں ضد ہے کہ تم ان کا مطالعہ اس وقت کرو گے۔ جب میں ان کا تشریحی ترجمہ شائع کروں۔ ایک حد تک تم بھی سچے ہو۔ مجھے تمہاری دقت کا احساس ہے۔ میں بتوفیق ایزدی، قرآن کریم کے لغت اور مفہوم کے کام سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اب تھوڑی سی صحت اور توانائی اور مل جائے تو بقایا کاموں کو بھی ہاتھ میں لوں گا۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

تصریحات بالا سے تم نے سلیم! دیکھ لیا ہوگا کہ قیاس درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (PROCESS) تھا ان قوانین کا ماخذ (SOURCE) نہیں تھا۔ لیکن جب ہمارے دور انحطاط میں، فکر و تدبر کا دروازہ بند ہو گیا تو یہی چیز قانون

شریعت کا ماخذ قرار پاگئی۔ یعنی اس وقت عقیدہ پیدا کر لیا گیا کہ اسلاف نے اپنے قیاس (اجتہاد) سے جو مسائل مستنبط کئے ہیں، وہ اخلاف کے لئے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتابیں ہمارے قوانین شریعت کا سرچشمہ ہیں۔

اجماع

قیاس کے بعد قوانین شریعت کا دوسرا ماخذ اجماع قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کے متعلق تو مختلف گروہوں کے اختلاف ایسے شدید اور وسیع نہیں تھے۔ لیکن اجماع کے متعلق صورت عجیب تر ہے۔ اول تو آج تک یہی طے نہیں پا سکا کہ اجماع سے مراد کیا ہے؟ اور جو کچھ طے پایا ہے، اس میں مختلف گروہوں کا اختلاف بڑا گہرا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہد حضرت عمرؓ تک امت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے نظام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسئلہ خلافت حضرت علیؓ کے نام پر امت میں سب سے پہلا اختلاف رونما ہوا۔ غیر شیعہ حضرات اس اختلاف کو سیاسی کہتے ہیں لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک یہ دینی مسئلہ تھا اور بڑا بنیادی۔ بہرحال مسئلہ سیاسی تھا یا دینی، اس کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہوا وہ غیر مبدل تھا۔ اس اختلاف کے بعد کوئی مسئلہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق کہا جائے کہ اس پر پوری امت کا اجماع تھا۔ لہٰذا اجماع سے مراد ساری امت کا اجماع نہیں۔ فقہا کے نزدیک کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اجماع کی فنی تعریف یہ ہے کہ

> رسول اللہ کی وفات کے بعد کسی بھی دور میں امت محمدیہ کے مجتہد کسی پیش آمدہ حادثہ پر خوب بحث و تمحیص کر کے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی جیسے الفاظ میں اعلان کریں۔ اس میں اگر کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تو یہ اجماع حقیقی کہلائے گا۔

اس قسم کے اجماع کے شرعی دلیل ہونے یا نہ ہونے میں اختلافات تو ایک طرف علماء کے ایک گروہ نے اس کے وجود کے امکان ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ وہ کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ امت میں اس قسم کا اجماع کبھی ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

اجماع کی دوسری شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ چند مجتہد ایک بات کہہ کر اس دور کے تمام مجتہدوں میں شہرت کر دیں۔ اگر کسی نے اس کے خلاف یا تائید میں کچھ نہیں کہا تو اسے اجماع سکوتی کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا چپ رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ایک گروہ نے اس کے بھی حجت شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے موافقین کا گروہ ہے کہ وہ منکرین اجماع کو کافر تک کہہ دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع شرعی دلیل بن سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک صحابہ کا اجماع۔ ان علماء کی بحثوں سے قطع نظر تم سیدھے سادے طور پر یہ سوچو سمجھو کہ امت میں فرقہ بندی کے بعد اگر کبھی کسی مسئلہ میں اجماع ہو گا بھی تو وہ ایک فرقہ کے اندر ہی ہو گا۔ دوسرے فرقہ کا الگ وجود خود اس کی شہادت ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلے کو حجت شرعی نہیں مانتا۔ اصل یہ ہے کہ جب امت میں پہلا تفرقہ (شیعہ اور غیر شیعہ) کا پیدا ہوا تو شیعہ قلیل التعداد میں تھے اور ہمیشہ قلیل التعداد میں رہے ہیں، اور سنیوں کی اکثریت تھی۔ پھر جب سنیوں میں مختلف گروہ پیدا ہوئے تو ان میں اہل فقہ کی اکثریت تھی، اہل فقہ میں حنفیوں کی اکثریت تھی۔ ان کی اکثریت ہر دور میں رہی ہے۔ اور آج بھی یہ تمام دنیا کے

مسلمانوں کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے اس قسم کی احادیث تائیداً پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا سوادِ اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگا۔[1] یہی جذبہ درحقیقت اجماع کے سرچشمۂ قانون قرار دیئے جانے کا محرک بھی ہے۔ اس اعتبار سے اجماعِ امت سے مفہوم ہوگا۔ امت کے گروہِ عظیم کا فیصلہ۔ یعنی حنفی مسلمانوں کا مسلک۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا　　　ہر فیصلہ (غیر حنفی تو ایک طرف خود سنیوں میں بھی) نہ اہلِ حدیث کے نزدیک قانونِ شریعت بن سکتا ہے۔ نہ دیگر ائمۂ فقہ۔ امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک۔

یہ ہے اجماع کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی حیثیت۔

حدیث

قیاس اور اجماع کے بعد قوانینِ شریعت کا تیسرا ماخذ حدیث کو قرار دیا جاتا ہے۔ ویسے تو احادیث کے متعلق شروع ہی سے بڑی طویل طویل بحثیں چلی آرہی ہیں۔ لیکن ہمارے زمانہ میں (بالخصوص پاکستان میں) اس سوال نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے کیونکہ یہاں یہ عملی سوال سامنے آگیا ہے کہ اسلامی مملکت کی قانون سازی میں حدیث کا مقام کیا ہے۔ اس سوال کا ملت کا سلجھانا بڑی نیک فال تھا لیکن جیسا کہ تم نے دیکھا ہے، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق خالص علمی اور دینی انداز سے گفتگو کی جاتی اسے سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا اور (جیسا کہ میں قیاس کے عنوان میں بتا چکا ہوں) سرے سے اس سوال ہی کو ملت میں مزید انتشار پیدا کرنے والا فتنہ قرار دیدیا گیا! بہرحال اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص (مختصر الفاظ میں) یہ ہے کہ

(۱) حدیث، اسلامی قوانینِ شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فیصلے احادیث میں آچکے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) بعض حضرات حدیث کے ساتھ سنت کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت کا مفہوم کیا ہے۔ اور اس میں اور حدیث میں کچھ فرق ہے۔ یا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں فرق ہے۔ حدیث ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اور سنت حضور کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں مرادف المعنیٰ ہیں۔

(۳) سنت میں صرف رسول اللہؐ کی سنت ہی داخل نہیں بلکہ سنتِ خلفائے راشدینؓ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ خلفائے راشدینؓ میں کون کون شامل ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان سے صرف اولین چار خلفائے رسول اللہ مراد ہیں۔ دوسرے گروہ نے لکھا ہے کہ نہیں! ان میں تمام وہ حکمران شامل ہیں۔ جنہوں نے امت کو اسلامی طریقہ پر چلایا یا جو آئندہ اسے اسلامی طریق پر چلائیں گے۔

(۴) پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا رسول اللہ کا ہر قول یا فعل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ یا ان میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ہے

---

[1] اجماع کے متعلق تفصیلی بحث اور اس حدیث پر تنقید کے لئے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۵ء ملاحظہ فرمایئے۔　　(طلوعِ اسلام)

کہ رسول اللہ اپنی رسالت کے پہلے دن سے زندگی کے آخری سانس تک بہر حال اور ہر حیثیت میں رسول تھے اس لئے حضور کا ہر قول یا عمل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں! رسول اللہ نے جو کچھ بہ حیثیت رسول فرمایا یا کیا تھا۔ وہی دینی حیثیت رکھتا ہے جو کچھ آپ نے اپنی بشری حیثیت یا تاریخ کے ایک خاص دور میں عرب کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے کہا یا کیا تھا۔ وہ شرعی حیثیت نہیں رکھتا

(۵) اس سے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ

(ا) کیا رسول اللہ کی سنت (یعنی آپ کا ثابت شدہ طریق) کسی خاص کتاب میں منضبط ہے۔ اور وہ کتاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ایسی صحیح اور قابل اعتماد ہے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

(ب) کیا احادیث کی کوئی ایسی کتاب ہے۔ جس کی ایک ایک حدیث بلاشک و شبہ رسول اللہ کی حدیث تسلیم کی جائے۔

(ج) کیا کسی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول فرمائی تھی۔ اور فلاں بات اپنی عام بشری یا تاریخی فرد ہونے کی حیثیت سے کہی تھی۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ ہاں! ایسی کتاب (یا کتابیں) ہیں جن کی ایک ایک حدیث یقینی طور پر صحیح ہے اور (چونکہ رسول اللہ کی دو حیثیت تھی ہی نہیں اس لئے) ہر حدیث رسول ہی کی حیثیت سے ہے۔ لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں! جسے تم سب سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد مجموعہ (یعنی بخاری شریف) بھی قرار دیتے ہو۔ اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ اس لئے اس کی بھی ہر حدیث کو بلا تنقید صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ

(۶) صحیح اور غلط حدیثوں کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ اسلاف ان معیاروں کو مقرر کر چکے ہیں۔ اور ان کے مطابق حدیثوں کی جانچ پرکھ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان معیاروں کے علاوہ ایک معیار یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں میں اسلام اور سیرت نبوی کے مطالعہ سے ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ کے مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ فوراً بتا دیتی ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی وہ بتا سکتا ہے کہ اگر یہ معاملہ رسول اللہ کے سامنے پیش ہوتا تو حضورؐ اس کے متعلق یہ فرماتے۔

(۷) اس آخری بات سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احادیث میں احکام مل جاتے ہیں۔ یا ایسے معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کے متعلق احادیث میں پہلے سے احکام موجود نہیں (جیسا کہ تم قیاس کے عنوان میں دیکھ چکے ہو) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احادیث کے ذریعے دین مکمل ہو چکا ہے۔ اب کوئی معاملہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ ایسے امور کا فیصلہ اجتہاد سے کیا جائیگا۔

(۸) یہ سوال بھی اٹھا کہ احادیث میں جو فیصلے مذکور ہیں (خواہ انہیں بالکل صحیح بھی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے) کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیر تبدیل رہیں گے یا ان میں بہ تقضائے حالات ردوبدل کیا جا سکتا ہے ایک گروہ نے یہ کہا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا

لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں! ان میں ایسے فیصلے بھی ہو سکتے ہیں جن میں تغیر حالات سے ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سلیم! مختصر طور پر خلاصہ ان مباحث کا جو حدیث کے متعلق ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام باہمد گر مختلف خیالات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان حضرات کے ہیں جو اپنے آپ کو حدیث کے ماننے والے کہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں جنھیں منکرین حدیث کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان تمام متضاد خیالات کے ماننے والے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) "حدیث ماننے والے" تسلیم کئے جاتے ہیں تو منکرین حدیث "صرف وہ لوگ رہ جائیں گے۔ جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کے متعلق تفصیلی فیصلے قرآن کریم کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ کے متعلق رسول اللہ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں (یعنی ان اصطلاحی معنوں میں اہل قرآن۔ ورنہ عام معنوں میں اہل قرآن تو ہر مسلمان ہے)

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث کے متعلق یہ بحثیں ہمارے زمانہ کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ بہت پہلے سے چلی آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ (پیدائش ۱۵۰ھ۔ وفات ۲۰۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب (کتاب الام) میں ایک گروہ سے اپنے ایک مناظرے کی روئداد لکھی ہے۔ جنھیں وہ منکرین حدیث کہتے ہیں۔

نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گزشتہ صفحات میں جن مختلف گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کے مختلف الخیال گروہ ہیں جو جمہور مسلمان کہلاتے ہیں۔ ان میں مخصوص معتقدات کے فرقے مثلاً اہل شیعہ یا مرزائی شامل نہیں)

حدیث کے متعلق جو مباحث تمہارے سامنے آ چکے ہیں۔ ان سے تم نے سلیم! اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس عقیدہ کو محض نظری طور پر متفق علیہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث قوانین شریعت کا ماخذ ہے۔ ورنہ عملاً آج تک متفق طور پر متعین ہی نہیں ہو سکا کہ کونسی احادیث قوانین شریعت کا ماخذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات سے یہ سوال کیا جائے تو اس کے متعین، واضح اور قطعی جواب سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور "کتاب وسنت" کی غیر متعین اصطلاح سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس لئے کہ انھیں معلوم ہے کہ جو تصریح ایک گروہ پیش کریگا وہ دوسرے کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگی۔ آج تک تو یہ معاملہ مساجد اور مدارس کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس لئے کہ وہاں ہر گروہ اپنے اپنے مسلک کو حق قرار دیتا اور اس کی تبلیغ کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہ سوال سامنے آیا کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا" تو لازماً یہ سوال بھی سامنے آنا چاہیئے تھا کہ سنت سے مراد کیا ہے۔ اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ اس کا جو جواب ایک گروہ دے وہ دوسرے گروہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے "مصلحت" اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے لیکن سلیم! تم سوچو کہ عملی دنیا میں کسی سوال کے جواب سے چشم پوشی کرنے سے کیسے کام چل سکتا ہے؟ اس سوال کا تعلق مملکت کی قانون سازی سے ہے۔ شخصی معاملات کی حد تک تو یہ کر لیا گیا ہے کہ کتاب وسنت کی وہی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو اس فرقے کے نزدیک قابل قبول ہوگی۔ لیکن جس معاملہ کا تعلق پورے ملک سے ہوگا۔ اس میں تو "کتاب وسنت" کی ایک ہی تعبیر قابل عمل ہوگی! سوچو کہ اس مقام پر کیا ہوگا؟

میں نے اس تفصیلی گفتگو کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ تم نے اپنے سوال کو اسی ضمن میں پوچھا ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھو۔

قرآن

قوانین شریعت کا چوتھا اور آخری ماخذ قرآن کریم ہے۔ تم یہ سمجھتے ہوگے کہ کم از کم قرآن کی حد تک تو تمام مسلمان (یعنی کم از کم سنی مسلمان) متفق ہوں گے۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں۔ ہماری بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ بھی اختلافی عقائد سے بلند نہیں رہی۔ یہ اختلافات مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہے۔ انہیں ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ہر آیت اپنے مقام پر واجب العمل ہے۔

(۲) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جن پر عمل تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ قرآن کے اندر موجود نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں وحی پر مبنی ہیں۔ حدیث قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔ احادیث، رسول اللہ کی خود متعین فرمودہ تفاصیل ہیں۔

(۴) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ احادیث قرآنی آیات کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس لئے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی پر مبنی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو حدیث کے فیصلہ کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن دوسرا گروہ اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔

(۵) احکام کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات کے متعلق بھی ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کا جو مفہوم روایات میں بیان ہوا ہے وہی مفہوم صحیح اور حرف آخر ہے۔ اس سے کوئی الگ مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جوں جوں زمانہ علم و انکشافات میں آگے بڑھتا جائے گا، قرآن کے معانی کھلتے چلے جائیں گے۔ اس لئے اس میں ہر زمانہ میں تفکر و تدبر کی ضرورت ہے۔

(۶) ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآنی احکام کی جو تفاصیل فقہ کی کتابوں میں آ چکی ہیں۔ وہی تفاصیل قابل قبول اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں۔ دوسرا گروہ اس عقیدے سے اختلاف رکھتا ہے۔

(۷) چونکہ اہل قرآن کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس لئے ان کے اس عقیدہ کا دہرا دینا بھی ضروری ہے کہ تمام معاملات کی جملہ تفاصیل قرآن کے اندر آ چکی ہیں۔ اس لئے قرآنی احکام کی تفاصیل کے لئے کسی اور طرف رجوع کرنا صحیح نہیں۔

ان تصریحات سے تم اندازہ کر لو سلیم! کہ یہ عقیدہ کہ "قرآن قوانین شریعت کا ماخذ ہے" جب عملی آئینہ میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔!

صحیح مفہوم

اس وقت تک سلیم! میں نے یہ بتایا ہے کہ اس مسلمہ کی حقیقت کیا ہے کہ قوانین شریعت کے چار ماخذ ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس اور ان اربعہ عناصر کا مروجہ مفہوم کیا ہے۔ اب میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ جہاں تک میری قرآنی بصیرت

میری راہ نمائی کرتی ہے۔ اس مسئلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی کا ٹھیک ٹھیک مقام کیا۔ ذرا غور سے سننا کہ اس کا تعلق اسلامی قوانینِ شریعت کے ایک ایسے بنیادی سوال سے ہے جس کے صحیح حل کے سامنے نہ ہونے سے امت اس قدر ذہنی انتشار اور عملی خلفشار میں مبتلا رہی ہے اور اب بھی ہے۔

قرآن

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے۔ جس سے وہ زندگی کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب دو انسانوں کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے تو ہر ایک کی عقل اپنے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ یہی چیز دو افراد سے آگے بڑھ کر دو گروہوں میں۔ اور پھر دو قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قوموں سے آگے بڑھ کر اقوام کے مخالف جتھوں میں۔ اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کے لئے، اور یہ بتانے کے لئے کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ اور اس کا نصب العین کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ راہ نمائی دی ہے۔ یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور اس سے باہر اور کہیں نہیں۔ قرآن کی راہ نمائی چونکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعین کرتے رہیں۔

ان جزئیات کے متعین کرنے کے طریق کے متعلق بھی قرآن نے راہ نمائی دیدی ہے اور وہ یہ کہ امت باہمی مشورہ سے اس اہم فریضہ کو سرانجام دے۔ اس طریق پر سب سے پہلے رسول اللہؐ نے عمل فرمایا (واضح رہے کہ قرآن نے رسول اللہ کو خصوصیت سے اس کی تاکید کی تھی) حضورؐ کے بعد آپ کے خلفاء (جانشینوں) نے ایسا ہی کیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک حکومت قائم کی تھی۔ اور یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ اس تصور کے ماتحت یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آ جائے گی کہ کوئی حکومت اپنی پیشرو حکومت کی سنت (طرزِ عمل) سے مستغنی ہو نہیں سکتی۔ جب کوئی حکومت مسلسل قائم رہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنے والی حکومتوں میں مسلسل نافذ العمل رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر نیا حاکم، سابقہ حاکم کے فیصلوں کو منسوخ کر کے تمام احکام از سرِ نو جاری کرے۔ ایک نئی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر قائم ہو، اس طرح کرتی ہے۔ لیکن ایک ہی انداز کی حکومت سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہ قائم رکھتی ہے تاوقتیکہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے۔ اس وقت وہ اس میں مناسب تبدیلی کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی انداز ہے جسے ہم رسول اللہؐ کے خلفا کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین (خلیفہ) مقرر ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسول اللہؐ کی اتباع کروں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت کی طرح نہیں ڈال رہا۔ میری حکومت سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں سنت رسول اللہ اور سنت حضرت ابوبکرؓ کی اتباع کروں گا۔ اس سے بھی مقصود یہی تھا۔

اس حد تک تو بات صاف ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی سابقہ فیصلے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا انھوں نے ایسی تبدیلی کی؟ تاریخ میں ہمیں سلیم! متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہد رسالتمآبؐ کے فیصلوں میں اور عہد صدیقیؓ کے فیصلوں میں ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے وابستہ بھی رہا اور زمانے کے بدلتے

ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کوئی قوم جو تسلسلِ حیات چاہتی ہے۔ اپنے ماضی سے اپنے آپ کو یکسر منقطع کر نہیں سکتی۔ لیکن ماضی سے وابستہ رہنا اور بات ہے اور ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا اور بات۔ ماضی سے وابستہ رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے سابقہ ادوار کے تجربوں سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ یاد رکھو سلیم! غیر متبدل صرف وہ راہ نمائی ہے جسے خدا نے ہمیشہ کے لئے اور تمام نوع انسانی کے لئے شمع راہ بنایا ہے۔ اس راہ نمائی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے انہیں تکمیل تک پہنچایا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ علم و بصیرت اور غور و تدبر سے زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل تلاش کریں۔ اگر انہیں زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق بنے بنائے قوانین دیدیئے جائیں اور انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیدیا جائے تو انہیں اپنی فکری صلاحیتوں کی نشوونما کا موقع کہاں ملے گا؟ نبوت کا دروازہ بند کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ذہن انسانی کی کھڑکیاں کھول دی جائیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! ایک مرتبہ پھر اس نقشے کو سامنے لاؤ جس کے مطابق عہد رسالتمآبؐ اور عہد خلفاء راشدین میں معاملاتِ زندگی کے متعلق فیصلے مرتب اور صادر ہوتے تھے۔ اس نقشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) رسول اللہؐ کے زمانے میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا ہدایت دی ہے۔ اس ہدایت کی روشنی میں حضورؐ اپنے صحابہؓ کے مشورے سے معاملہ کی جزئیات طے فرماتے۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو دیکھا جاتا کہ حضورؐ کے زمانہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہوا تھا اگر کوئی فیصلہ موجود ہوتا تو اسے اختیار کر لیا جاتا۔ ورنہ طریق بالا کے مطابق اس کی جزئیات خود طے کر لی جاتیں۔ اس کا نام اتباعِ کتاب و سنت تھا۔

(۳) یہی انداز حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رہا۔ اس میں رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا۔ دوسری قوموں سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ معاملات کی نوعیت بدل گئی۔ بعض حالات میں تغیر واقع ہو گیا۔ اس لئے آپ کو بکثرت نئے فیصلے بھی کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات بھی کرنی پڑیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس اندازِ حکومت میں کس طرح قرآن، سنت، اجماع اور قیاس چاروں اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں۔ کتاب اللہ کی اصولی راہ نمائی، سابقہ حکومت کے فیصلے (سنت) ان کی روشنی میں نئے معاملات کے لئے از روئے قیاس نئے فیصلے یا سابقہ فیصلوں میں تبدیلی اور مشاورتی نظام کے ماتحت ان فیصلوں کا اجراء (اجماع) یہ تھا اس وقت صحیح مفہوم کتاب و سنت، اجماع اور قیاس کا۔

جیسا کہ میں سلیم! پہلے بھی لکھ چکا ہوں جب ایک انداز کی حکومت مسلسل آگے چلتی جائے۔ تو اس میں سابقہ فیصلوں سے مستغنی ہوا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں سابقہ فیصلے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں نئے فیصلوں کا اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ اور عند الضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تو حکومت کا یہی نقشہ آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن

بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت تو آگے چلی لیکن اس کا انداز مختلف ہوگیا۔ یہی انداز مختلف اسلامی ممالک میں اس وقت تک چلا جارہا ہے۔ اب اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان چاہیں کہ اپنے ہاں اسی پہلے انداز کی حکومت (خلافت علیٰ منہاج نبوت) قائم کریں تو ان کے ہاں قانون سازی کی وہی صورت پیدا ہوجائے گی۔ جو اس زمانہ میں تھی۔ اس میں کتاب اللہ کی راہ نمائی کو مستقلاً سامنے رکھا جائے گا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ معاملہ پیش نظر کے لئے سابقہ دور کے تاریخی نوشتوں میں کوئی نظائر (PRECEDENTS) ملتے ہیں یا نہیں۔ اگر ملتے ہوں اور زمانہ کے اتنے بعد کے باوجود ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انہیں علیٰ حالہٖ اختیار (ADOPT) کرلیا جائے گا۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تو تغیر حالات پر قیاس کرکے مناسب تبدیلی سے اسے (ADAPT) کرلیا جائے گا۔ یا عند الضرورت کوئی نیا فیصلہ کرلیا جائے گا۔ اور جب اس فیصلہ کو مرکز ملت (نظام یا حکومت) کی طرف سے نافذ کیا جائیگا تو اس پر سب کا اجماع بھی ہوگا۔ یہ عملی مفہوم ہوگا سلیم! کتاب۔ سنت۔ اجماع اور قیاس کا۔ اس میں تم دیکھو گے کہ نہ کسی قسم کی کوئی الجھن پیش آتی ہے نہ سلوٹ۔ نہ فرقہ بندی کی گنجائش رہتی ہے نہ مختلف فقہی مذاہب کی ضرورت۔ سب کی راہ نمائی کے لئے ایک کتاب۔ نمائندگان ملت پر مشتمل ایک پارلیمان جو قیاس اور اجتہاد کے فرائض سرانجام دے۔ اس نظام کے مرکز کی طرف سے جاری شدہ فیصلے سب کے لئے واجب التسلیم اور ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج کو لئے ہوئے اسلامی نظام امت کا رواں دواں آگے بڑھتے جانا

تصریحات بالا سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ جہاں تک قانون شریعت کے ماخذ کا تعلق ہے۔ اس کا درحقیقت ماخذ ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ۔ باقی تینوں شقیں دراصل قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں۔ کتاب اللہ کی روشنی میں کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ نافذ کردینا، اتباع سنت کہلائے گا۔ نئے معاملات پر غور و خوض کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا۔ اور امت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا اور انہیں نافذ کرنا اجماع کہلائے گا۔ لہٰذا اسلامی قانون شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہے۔ اور یہی مفہوم ہے حسبنا کتاب اللہ کا۔ والسلام۔

پرویز

طاہرہ کے نام خط آئندہ پرچے میں آرہا ہے

سلیم کے نام

از:- پرویز

نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

باب نہم ۔ خودی کی تربیت کے تین مراحل

اطاعت ۔ ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مثنوی اسرارِ خودی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسانی خودی کی نشوونما کیسے ہوتی ہے۔ اس میں استحکام و ثبات کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر باب میں علامہ اقبال نے اس کی تربیت (نشوونما اور تکمیل تک پہنچنے کے) تین مراحل بیان کئے ہیں۔ ان میں پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔

ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ خودی کی بنیادی خصوصیت آزادی (FREEDOM) ہے جوں جوں خودی کی تربیت ہوتی جاتی ہے۔ اس میں آزادی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس قدر خودی آزاد ہوگی۔ اسی قدر اسے نشوونما یافتہ سمجھا جائے گا یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خودی کی بنیادی خصوصیت آزادی ہے۔ تو پھر اطاعت کیسی؟ آزادی اور اطاعت باہمد گر نقیض ہیں جو آزاد ہے۔ وہ کسی کا مطیع و فرماں پذیر نہیں۔ جو کسی کا مطیع ہے۔ وہ آزاد نہیں۔ لہٰذا یہ دو متضاد تصور ہیں۔

لیکن یہ متضاد تصور نہیں۔ اس میں جو ذہنی اشکال (CONFUSION) پیدا ہوتا ہے۔ وہ اطاعت کے صحیح مفہوم کے سامنے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اطاعت یہ ہے کہ کسی فرد کا اپنا ارادہ و اختیار کچھ نہیں۔ وہ ایک مشین (AUTOMATON) کی طرح ہے۔ دوسرا شخص جو حکم دیتا ہے۔ وہ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اسے اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس حکم کا مطلب کیا ہے یا مصلحت کیا جس طرح ایک مشین کے سامنے کوئی مقصد (PURPOSE) نہیں ہوتا۔ وہ مشین چلانے والے کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ مشینی انسان بھی اپنے سامنے زندگی کا کوئی اپنا مقصد نہیں رکھتا۔ وہ دوسرے انسان کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اس اطاعت کو اطاعت نہیں بلکہ غلامی کہتے ہیں۔ یعنی ایسی زندگی جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کا آلہ کار (INSTRUMENT)

بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن اس غلامی کو انسانیت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیتا ہے۔ اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ اس کے نزول کا مقصد نوعِ انسانی سے اس لعنت کو دور کرنا ہے۔

اطاعت کے دوسرے (اور صحیح) مفہوم کے لئے یوں سمجھئے کہ (مثلاً) ڈاکٹر نسخہ دیتے وقت آپ سے کہتا ہے کہ دوائی یوں استعمال کرنا اور اتنے دنوں تک فلاں فلاں چیز بالکل نہ کھانا۔ آپ اس کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اس تعمیلِ حکم میں اور اور پہلی قسم کی فرماں پذیری میں کس قدر فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ڈاکٹر کے اس حکم کو حکم کہا جائے گا۔ نہ آپ کے اس تعمیل کو فرماں پذیری۔ ڈاکٹر آپ کو ہدایات دیتا ہے۔ اور آپ ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یا اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپ از خود فیصلہ کرتے ہیں کہ مجھے علی الصبح سورج نکلنے سے بہت پہلے اٹھنا اور روزانہ سیر کے لئے جانا چاہیئے۔ اس کے بعد آپ اپنے اس فیصلہ پر کاربند رہتے ہیں اور روزانہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یا مثلاً آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ میرے سامنے جب بھی کوئی معاملہ آئے گا۔ میں اس کا فیصلہ ہمیشہ انصاف کے ساتھ کیا کروں گا۔ اس کے بعد آپ اس اصول پر شدت سے کاربند رہتے ہیں۔

ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ ان تمام امور میں آپ "اطاعت" کرتے ہیں۔ لیکن یہ اطاعت کسی دوسرے کے حکم کی نہیں۔ بلکہ کسی اصول یا قانون کی اطاعت ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ان پابندیوں کی اطاعت ہے جنہیں آپ نے از خود اپنے دل کی مرضی اور اختیار سے اپنے آپ پر عائد کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ آپ بطیبِ خاطر کرتے ہیں۔ طوعاً کرتے ہیں (کرہاً نہیں کرتے) طوعاً اور اطاعت کے معنی بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ یعنی اطاعت کے معنی "اپنے دل کے اختیار و ارادہ سے (بطیبِ خاطر) کسی اصول یا قانون کی اتباع" ہے۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم آپ نے دیکھا کہ اس میں انسان کی آزادی سلب نہیں ہوتی۔ وہ کسی کا غلام اور تابعِ فرمان نہیں بنتا۔ وہ اپنی پوری آزادی سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کرتا ہے۔ اور پھر اس پر کاربند رہتا ہے۔ یعنی غلامی دوسرے انسان کے احکام کی تابعداری کا نام ہے اور اطاعت کسی اصول یا قانون کی از خود اتباع کا نام۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی کی تربیت کے لئے اس قسم کی اطاعت کیوں ضروری ہے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ دنیا میں تعمیری نتائج وہی قوتیں پیدا کرتی ہیں۔ جو کسی قاعدے اور ضابطے، اصول اور آئین کے ماتحت صرف کی جائیں۔ پانی اگر ساحلوں کے اندر بہتا ہے تو اس سے ہزار قسم کی نفع بخشیوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہی پانی جب ساحل کو توڑ کر بے محابا بہنے لگ جائے تو اسے سیلاب کہا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانی ذات کی تعمیر، تربیت اور استحکام کے لئے اصول یہ مقرر کیا گیا ہے کہ انسان جس قدر ایسے کام کریگا جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہوں۔ اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی قوتیں سرکش اور بیباک نہ رہیں، بلکہ اصول و آئین کے ساحلوں کے اندر مصروفِ عمل رہیں۔ لہٰذا انسان جس قدر اپنے اوپر پابندیاں عائد کرتا جائے گا۔ اور اس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح ساحلوں کے اندر رکھتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا، اسی قدر اس کی خودی کو آزادی نصیب ہوتی جائے گی۔ اور اس کے اختیارات کی حدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں گی۔ اس طرح جبر سے اختیار پیدا

ہوتا جائے گا۔

یہ ہے وہ حقیقت جسے علامہ اقبال نے زیر نظر باب میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ "مرحلۂ اطاعت" کے زیر عنوان ایک مثال سے آغاز سخن کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

خدمت و محنت شعارِ اشتر است
صبر و استقلال کارِ اشتر است

تم اونٹ کو دیکھو کہ اس کا شعار زندگی اور اسلوب حیات محنت اور خدمت ہے۔ اور اس روش میں وہ اس قدر استقامت اور استقلال سے لگا رہتا ہے کہ یہ چیز ضرب المثل بن گئی ہے۔

گامِ او در راہِ کم غوغاستے
کارواں را زورقِ صحراستے

وہ سفر حیات میں نہایت خاموشی سے چلے جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بھی کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ ندی کی پرسکوت روانیوں کی طرح خاموش۔ لیکن ہمیشہ محوِ خرام۔ ایسے جیسے دریا میں کشتی چلی جا رہی ہو۔ اس لئے اہل قافلہ اسے صحرا کا جہاز (SHIP OF THE DESERT) کہتے ہیں۔

نقشِ پایش قسمتِ ہر بیشۂ
کم خورد، کم خواب و محنت پیشۂ

کون سا صحرا اور بیابان ایسا ہے جس کی قسمت میں اس کا نقش پا نہیں لکھا! اس کے پاؤں کا نشان ہر بیابان کی پیشانی پر موجود ملے گا بہت کم کھانے والا۔ بہت کم سونے والا۔ ہمیشہ مصروف سفر۔

مست زیرِ بارِ محمل می رود
پائے کوباں سوئے منزل می رود

محمل کا بوجھ پشت پر لادے، ایں و آں سے بے خبر، اپنی رفتار کی مستی میں گم، منزل کی طرف رواں دواں چلا جاتا ہے۔

سرخوش از کیفیتِ رفتارِ خویش
در سفر صابر تر از اسوارِ خویش

اسے خود اپنی رفتار کی کیفیت سے ایسا نشہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کی لذت اسے تکان محسوس نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنی محنت کا صلہ کہیں خارج سے نہیں چاہتا۔ اس کی رفتار کی لذت اس کے لئے خود صلہ بن جاتی ہے۔ اور اسی لئے سفر میں وہ اپنے سوار سے بھی زیادہ صابر ہوتا ہے۔

اونٹ کو یہ سب کچھ اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے کبھی منہ نہیں موڑتا۔ اور یہی چیز اسے منزلِ مقصود

تک پہنچا دیتی ہے لہٰذا۔

تو ہم از بارِ فرائض سر متاب
برخوری از عندۂ حسن الماب

تجھے بھی چاہیئے کہ اسی روش کو اختیار کرے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی سے پہلو تہی نہ کرے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً زندگی کی بہترین خوشگوار منزل تک پہنچ جائے گا۔ تیرا انجام سفر نہایت حسین و شادکام ہوگا۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

اے غفلت شعار! تو آئین و اصول کی اطاعت میں پوری پوری کوشش کر۔ تم اس اصول سے باخبر نہیں ہو کہ حقیقی اختیار اپنے اوپر پابندیاں عائد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پابندیوں کے بغیر آزادیٔ اختیار نہیں بلکہ بے باکی اور سرکشی بن جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ناکس از فرماں پذیری کس شود
آتش از باشد ز طغیاں خس شود

اگر نااہل بھی اطاعت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ سزاوار تعظیم و تکریم اور درخور حمد و ستائش بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اصول و آئین سے سرکشی اختیار کرے تو اس کی آتش سوزاں کی سی توانائیاں خس و خاشاک کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہیں۔

ہر کہ تسخیرِ مہ و پروین کند
خویش را زنجیریٔ آئین کند

یاد رکھیئے! چاند، سورج، ستاروں کو وہی مسخر کر سکتا ہے جو پہلے اپنے آپ کو آئین کا پابند کرے۔ آئین و اصول کی پابندی سے انسانی قوتوں میں اس قدر ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے کہ خارجی کائنات کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بادرا زندانِ گل خوشبو کند
قید بو را نافۂ آہو کند

عام ہوا اگر کچھ وقت کے لئے پھول کے اندر پابند ہو کر رہ جائے تو وہ خوشبو بن جاتی ہے۔ اور اگر خوشبو نافۂ آہو کے اندر مقید ہو جائے تو وہ رفتہ رفتہ مشک بن جاتی ہے۔

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سرِ تسلیم خم

کائنات کا ایک ایک ذرہ آئین کا پابند ہے ۔۔۔ کیا مرغ ماہی کیا چاند تارے۔ اجرام فلکی جو اس ناپیدا کنار فضا کی وسعتوں میں اس طرح تیرتے پھرتے ہیں، مصروف آوارگی نہیں۔ ان کے سامنے ایک منزلِ مقصود ہے، اور ان میں سے ہر ایک اس منزل کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے۔ یہ تمام نظم و نسق اس حسن و خوبی کے ساتھ اس لئے چل رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک قانون اور آئین کا پابند ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ثانیہ کے لئے بھی آئین کی پابندی سے آزاد ہو جائے تو یہ تمام سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جائے۔

سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است
پائمال از ترکِ آں گردیدہ است

تم دیکھتے ہو کہ خشک مٹی سے کس طرح لہلہاتا سبزہ اُگ کھڑا ہوتا ہے؟ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ محض قانون کی پابندی سے فطرت نے ہر شے کی نشو و نما کے لئے ایک قانون مقرر کر رکھا ہے۔ جب سبزہ اس قانون کی اتباع کرتا ہے تو اس میں روئیدگی پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ اس کی پابندی چھوڑ دیتا ہے تو خس و خاشاک میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے ہوا کے جھونکے ادھر اُدھر لئے پھرتے ہیں اور اس طرح وہ گلیوں کے روندے ہوئے تنکوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لالہ پیہم سوختن قانونِ او
بر جہد اندر رگِ او خونِ او

گل لالہ کے لئے قانونِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنے سینے کی آگ کو ہر وقت روشن رکھے۔ اس کے لئے اس کی رگوں میں خون زندگی ہر وقت متحرک اور موجزن رہتا ہے۔ اس جہد و سوز کا نام لالہ کی رنگینی ہے۔

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل
ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

پانی کے قطرے الگ الگ رہیں تو انھیں دریا نہیں کہا جاتا۔ وہ دریا کی شکل اس وقت اختیار کرتے ہیں، جب قانونِ اتصال (ایک دوسرے سے ملنے کے قانون کی رو) سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ چلتے اور آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ریت کے منتشر ذروں کو صحرا نہیں کہا جاتا۔ ذرے صحرا میں اس وقت تبدیل ہوتے ہیں، جب وہ اپنا تشتت و انتشار چھوڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے قانون کی اتباع کرتے ہیں۔ غرضیکہ

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

کائنات کی ہر شے کی اندرونی قوت کا اندازہ اس میں ہے کہ وہ آئین و قانون کی پابند ہے۔ لہٰذا جب کائنات کی ہر شے کا مسلکِ زندگی یہ ہے تو تو اس تقویت بخش ساز و سامانِ حیات سے کیوں غافل ہے؟ تو کیوں آئین کی پابندی نہیں کرتا؟ تجھ میں اور کائنات کی دیگر

اشیاء میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے آئین کی پابندی نہیں کرتیں۔ انھیں اس پابندی کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو آئین کی پابندی اختیار کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے سرکشی اختیار کرے گا، تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کی پابندی اختیار کرے گا۔ تو اس کی زندگی کامیابیوں اور کامرانیوں کی جنتی زندگی ہوگی۔ لہٰذا

بازائے آزادِ دستورِ قدیم
زینہار پاکن ہماں زنجیرِ سیم

اس مقام پر حضرت علامہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اس دستورِ قدیم کی پابندی چھوڑ دی ہے جس نے عربوں جیسی بادیہ نشین قوم کو دیکھتے ہی دیکھتے قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا تھا۔ تو نے اس آئین کی پابندی چھوڑ دی جسے نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دیا گیا تھا۔ اور جو فرد کی ذات کی تکمیل اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ضامن تھا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں تجھے پھر سے وہی مقامِ امامتِ امم حاصل ہو جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ تو پھر اسی آئین کا پابند ہو جا۔ اور اس طرح دنیا بھر کی غلامی کی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کرلے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدہ سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ایک آئین خداوندی کی پابندی، ہزاروں انسانوں کی غلامی سے چھڑا دیتی ہے۔ لیکن آئین کی یہ پابندی، بہ طیب خاطر ہونی چاہیئے دل کے پورے حجکاؤ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کی گرانی اور ناگواری محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر گرانی و ناگواری ہوگی تو وہ اطاعت نہیں رہے گی۔ غلامی اور محکومی بن جائے گی۔ لہٰذا

شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مشو

اس کی کبھی شکایت نہ کر کہ آئین و قوانین سخت ہیں۔ یہ سخت اس وقت تک محسوس ہوں گے۔ جب تک تو ان کی پابندی مجبوراً اختیار کرے گا۔ جب ان کی اطاعت کا جذبہ تیرے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ تو ان کی پابندی تیرے لئے عین حیات بن جائیگی۔

مرحلۂ دوم۔ ضبطِ نفس

اس کے بعد علامہ اقبال تربیتِ خودی کے دوسرے مرحلہ کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ضبطِ نفس۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اطاعت کے اس مفہوم کو سامنے رکھیں۔ جس کا ذکر ابتدائے باب میں کیا گیا ہے۔ تو ضبطِ نفس خود اس کے اندر آجاتا ہے۔ ہم نے بتایا ہے

کو اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ اور دل کی خواہش سے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرے۔ اور پھر ان پابندیوں پر استقامت سے کاربند رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ پر ضبط رکھے۔ اگر اسے اپنے آپ پر ضبط نہیں تو وہ خود عائد کردہ قیود کی پابندی کر ہی نہیں سکے گا۔ مثلاً آپ نے اپنے آپ سے فیصلہ کیا ہے کہ آپ صبح سویرے اٹھ کر سیر کے لئے جائینگے جب صبح آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ باہر بہت سردی ہے اور نرم و گرم لحاف میں بڑی راحت۔ اگر آپ پر تن آسانی کا جذبہ غالب آگیا تو پھر آپ لحاف میں منہ لپیٹ کر سو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ نے اپنے فیصلہ کی پابندی کو زیادہ اہمیت دی تو آپ ہزار سردی کے باوجود، باہر نکل کھڑے ہوں گے۔

یا مثلاً آپ نے فیصلہ کیا کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس کے بعد آپ کے سامنے ایک ایسا کاروباری معاملہ آیا کہ جس میں اگر آپ تھوڑے سے جھوٹ سے کام لیں تو آپ کو ہزاروں روپیہ مفت میں مل جاتا ہے۔ دولت کی ہوس آپ کو آمادہ کرتی ہے کہ آپ جھوٹ بول دیں۔ اگر یہ ہوس آپ پر غالب آگئی تو آپ اصول پرست نہ رہے۔ لیکن اگر آپ نے آئین کی پابندی کو اہمیت دی تو آپ حصولِ دولت کے اس خیال کو جھٹک کر آگے نکل جائیں گے۔ اور اصول کو ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ اس کا نام ضبطِ نفس ہے۔ یعنی ہر اس میلان و رجحان کا مقابلہ جو آپ کو اصول شکنی کی دعوت دے۔ اس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔ خودی کے پرکھنے کا معیار ہی یہ ہے کہ آپ ان داخلی اور خارجی قوتوں کا کس حد تک مقابلہ کرتے ہیں جو آپ کو آئین شکنی پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان داخلی قوتوں کو علامہ اقبال نے نفس سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لفظ کے خصوصی معنی ہیں۔ جن میں یہ عام طور پر تصوف کے لٹریچر میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے حقیقی معنی یہ نہیں۔ بہرحال، ان معانی کے پیش نظر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ۔

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است

تیرا نفس اونٹ (یا ہر حیوان) کی طرح اپنا پیٹ پالنے کی فکر میں ہی رہتا ہے۔ کسی دوسرے کا اسے خیال ہی نہیں آتا۔ اس کا مقصدِ حیات، اپنی پرستش کرنا ہے۔ یہ خود اپنی مرضی کے مطابق چلنا چاہتا ہے۔ کسی آئین کے تابع نہیں رہنا چاہتا۔ اگر اسے قانون کی اطاعت کی طرف بلاؤ تو اس سے سرکشی برتتا ہے۔

اس میں 'خود پرور' کا ٹکڑا بڑی معنی خیز ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا راز اس میں ہے کہ یہ دوسروں کی نشوونما کی فکر کس حد تک کرتا ہے اسے ربوبیت عامہ کہتے ہیں۔ لیکن انسانی عقل ہر فرد کو یہی تلقین کرتی ہے کہ تجھے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہوتی ہے جس میں ہر حیوان صرف اپنی فکر کرتا ہے۔ اسی کو خود پروری کہتے ہیں۔ لیکن وہ آئینِ زندگی جو وحیٔ خداوندی پر مبنی ہے انسان سے یہ کہتا ہے کہ زندگی کا راز ربوبیت عامہ میں ہے۔ بقول اقبال

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

دی حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اس لئے ضروری ہے کہ عقلِ بے باک کو دحیٔ خداوندی کے تابع رکھا جائے۔

مرد شو آور زمام او بکف
تا شوی گوہر اگر باشی خزف

تو ہمت مردانہ سے کام لے اور اس اشترِ خود پرور و خود سرکی مہار اپنے ہاتھ میں رکھ۔ اس طرح تیری خام خودی (جو کوڑی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی) گوہرِ ارجمند میں تبدیل ہو جائے گی۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر دیگراں

جو شخص اپنے نفس پر اپنا حکم نہیں چلاتا وہ ساری دنیا کا محکوم و غلام ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ پر اپنا حکم چلانے سے مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اصول و آئین کی پابندی میں ضبطِ نفس سے کام لے۔

سوال یہ ہے کہ انسان نفس پروری کا مسلک اختیار کیوں کرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی عقل اسے قدم قدم پر یہ کہہ کر ڈراتی ہے کہ اگر تیرے پاس کچھ نہ رہا تو تو تباہ ہو جائے گا۔ اگر تو نے اپنی اولاد کے لئے جائدادیں نہ چھوڑیں تو وہ بھوکوں مر جائیں گے۔ اس لئے تجھے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنی چاہیئے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جو انسان کو مفادِ خویش کا پرستار بنا دیتا ہے۔ اور اس کی نگاہ میں وسعت نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اس کے ساتھ ہی مال و دولت اور زن و فرزند میں اتنی کشش و محبت ہے کہ انسان ان کی خاطر جائز و ناجائز سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ان دونوں جذبات کو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کہتے ہیں۔ ضرر رساں کا خوف اور نفع بخش کی کشش و محبت۔ چنانچہ علامہ کہتے ہیں۔

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

انسان کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اس میں محبت اور خوف کے جذبات پیوست کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔

خوفِ دنیا۔ خوفِ عقبےٰ۔ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں

دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف۔ ارضی و سماوی بلاؤں کا خوف۔ ہر طرف سے خوف۔ دوسری طرف۔

حبِ مال و دولت و حبِ وطن
حبِ خویش و اقربا و حبِ زن

مال و دولت، وطن، زن و فرزند۔ اقربا اور خود اپنی ذات کی محبت۔ خوف اور محبت کے اس امتزاج کا نام انسان ہے۔

امتزاجِ ما و طین تن پرور است
کشتۂ فحشا و ہلاکِ منکر است

یہ حیوانی سطح کی زندگی، جس کا نام حیاتِ طبعی یا جسمِ انسانی ہے۔ تن پروری سکھاتی ہے۔ اس کی نگاہ جسم کی پرورش سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ہر وہ شے جو جسم کی راحت و آرام میں ممد ہو۔ اس کے نزدیک محمود ہے اور جس چیز سے جسم کی عیش سامانیوں میں کچھ فرق پڑے۔ وہ مذموم ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ سامانِ عیش و تنعم حاصل کس طریق سے کیا جاتا ہے۔ وہ جائز طریق سے ہو یا ناجائز طریقت، اس میں نفسِ انسانی کوئی تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ناجائز طریقوں سے سامانِ راحت و آرام آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ ان طریقوں کا گرویدہ رہتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مال و دولت اور زن و فرزند ایسے شجرہائے ممنوعہ نہیں کہ ان کی کشش جرم اور گناہ قرار پا جائے۔ اس قسم کا تصور رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان چیزوں میں کشش و جاذبیت رکھی گئی ہے۔ اور ان کا حصول مومن کے لئے ضروری ہے۔ جس مقام پر یہ چیزیں مذموم اور وجہِ فتنہ بن جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان کی خاطر انسان زندگی کے کسی اہم اصول کو قربان کر دے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ ایک طرف اصول پرستی ہو اور دوسری طرف یہ چیزیں، تو ان چیزوں کی محبت اور کشش اصول پر غالب نہیں آنی چاہیئے۔ اسی طرح جس چیز کو خوف کہا گیا ہے وہ بھی یہ ہے کہ جب اصول اور متاعِ زیست میں تصادم ہو تو انسان اس خیال سے اصول کو چھوڑ دے کہ اس کی پابندی سے مال و دولت، زن و فرزند یا خود انسان کی اپنی جان چلے جانے کا خطرہ ہے۔ یہ ہے وہ خوف جس سے انسان کی خودی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے قرآن اس قسم کے خوف کو دور کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کا ابتدائی نقطہ یہ ہے کہ اس کائنات میں خدا کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان جھکے یا اس سے ڈرے۔ خدا کے سامنے جھکنے سے بھی مراد اس آئین و قانون کی پابندی ہے جسے اس نے تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے متعین کر کے انسانوں کو دیا ہے۔ لہٰذا دل سے ہر قسم کے خوف کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کو صاحبِ اقتدار تسلیم نہ کرے۔ اس حقیقت کو علامہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

جب تو اپنے دل میں اس یقین کو محکم کر لے کہ خدا کے علاوہ کائنات میں کوئی اور قوت ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے تو پھر خوف کا ہر طلسم تیرے سامنے تارِ عنکبوت کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ "خوف" کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ محض فریب ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے "طلسم" کہا گیا ہے۔

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش

جس شخص کے اندر حق حلول کر جائے۔ اس طرح جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اور وہ یوں اس کے جسم میں جان کی حیثیت اختیار کر لے تو ایسے شخص کی گردن کبھی باطل کے سامنے جھک نہیں سکتی۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

ایسے شخص کے سینہ میں خوف داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل اللہ کے سوا کسی اور قوت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

جو شخص بھی لاالٰہ کی اس حقیقت کو بطور اصول اساسی اختیار کرے وہ زن و فرزند کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ متاہل زندگی کو تیاگ کر جنگلوں میں سنیاس اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال و دولت یا زن و فرزند بگی حق پرستی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتے۔ اگر کبھی ایسا وقت آئے کہ اسے کسی اصول کی خاطر انھیں چھوڑنا پڑے تو وہ بلا ادنےٰ تامل انھیں چھوڑ دے گا۔

می کند از ما سوے قطع نظر
می نہد ساطور بر حلق پسر

ایسا شخص اس قسم کے تصادم کے مقام پر اللہ کے سوا ہر چیز سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ اور اگر اصول پرستی کا تقاضا ہو تو وہ (حضرت ابراہیم کی طرح) خود اپنے بیٹے کے حلق پر بھی خنجر رکھ دیتا ہے۔ جس شخص کا ایمان اس قدر محکم ہو اس میں ایسی قوتیں آ جاتی ہیں جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

با یکے مثل ہجوم لشکر است
جان بچشم او ز باد ارزاں تر است

اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تنہا بھی ایک لشکر جرار کے برابر ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک جان ہوا سے بھی کم قیمت رکھتی ہے۔ کمزور وہ ہوتا ہے جسے جان بچانے کی فکر پریشان کر رہی ہو۔ جو شخص جان کی پرواہ نہ کرے اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانہ!

لیکن لاالٰہ کی یہ عملی کیفیت (کہ جس سے ایک مرد مومن، تنہا بھی لشکر جرار پر بھاری ہو جاتا ہے) نظام صلوٰۃ کے قیام سے پیدا ہوتی ہے جو مسلمان کو اجتماعی حیثیت سے قانون خداوندی کی کامل اطاعت کا خوگر بناتی ہے۔ اس لئے

لاالٰہ باشد صدف، گوہر نماز
قلب مسلم را حج اصغر نماز

لاالٰہ وہ سیپ ہے جس کے اندر گوہر یکدانہ صلوٰۃ کی شکل میں تربیت پاتا اور متشکل ہوتا ہے۔ قلب مسلم کے نزدیک صلوٰۃ حج

ہے یعنی چھوٹے پیمانے پر حج تمام دنیا کے مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ کا مظہر ہوتا ہے اور صلوٰۃ کسی خاص مقام کے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی آئینہ دار۔ اس لئے یہ چھوٹے پیمانے پر حج ہوتا ہے۔

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است
قاتلِ فحشاء و بغی و منکر است

صلوٰۃ مسلمان کی ہاتھ میں شمشیر برہنہ کی طرح ہوتی ہے جس سے باطل کی گردن کٹ جاتی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر کو روک دیتی ہے۔ جس معاشرے میں صلوٰۃ کا نظام قائم ہو۔ وہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور مذموم حرکات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس میں افلاس کا خوف اور عقل فریب کار کی دسیسہ کاریاں باقی نہیں رہ سکتیں۔ یہ ہے قرآن کی رو سے صلوٰۃ کا فطری اور لازمی نتیجہ (سوچئے کہ جس قسم کی نمازیں ہم آجکل پڑھ رہے ہیں کیا ان سے بھی یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں؟)

صلوٰۃ کے بعد صوم (روزہ) آتا ہے جو ضبطِ نفس (DISCIPLINE) کے لئے ایک تربیتی نصاب (REFRESHER COURSE) کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزہ برجوع و عطش شبخوں زند
خیبرِ تن پروری را بشکند

روزہ، بھوک اور پیاس پر چھاپہ مارتا ہے اور ان کی سختیوں اور تلخیوں کو ختم کر کے انسان کو محنت و مشقت کی زندگی کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح تن پروری کے محکم قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ روزہ کے بعد حج کو دیکھئے۔

مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حج سے قلب مومن کی شمعیں فروزاں ہو جاتی ہیں۔ اس کا سینہ روشن اور تابناک ہو جاتا ہے۔ اس میں وسعت اور کشائش پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا پہلا سبق یہ ہے کہ وطن کی محبت ایسی چیز نہیں جو اصول پرستی کی راہ میں حائل ہو جائے۔ اگر اصول کی خاطر وطن کو چھوڑنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایک مرد مومن بلا ادنیٰ توقف اپنے دامن سے وطن کی خاک جھاڑ کر اس نصب العین کی طرف گامزن ہو جاتا ہے جسے وہ نظام خداوندی کے لئے زیادہ سازگار سمجھتا ہے۔ مغرب کی نیشنلزم نے دنیا کو سکھایا ہے کہ وطن کی خاطر سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کی سیاست مومن کو یہ سکھاتی ہے کہ حق کی خاطر وطن تک کو بھی چھوڑا جا سکتا ہے نیز حج یہ بھی سکھاتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وجہ جامعیت دین کی حبل متین اور قانون خداوندی کی اطاعت ہے۔ لیکن یہ اطاعت ایک زندہ مرکز کے بغیر ممکن نہیں۔ حج سے مقصود ملت اسلامیہ کے مرکز کا قیام و دوام ہے۔ اس مرکز سے کتاب ملت بیضا کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔

طاعتے سرمایۂ جمعیتے
ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

قوانین الٰہیہ کو عملاً نافذ کرنے والا مرکز اور اس مرکز کی اطاعت، یہ ہے اصل اسلام۔ اس سے ملت میں ربط و ضبط قائم رہتا ہے۔ اگر یہ نظام باقی نہ رہے تو مسلمان انفرادی زندگی بسر کرتا ہے۔ جماعت کی زندگی نہیں۔ اور اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

صلوٰۃ۔ صوم اور حج کے بعد زکوٰۃ کو لیجئے۔

حُبِ دنیا را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

زکوٰۃ یعنی اپنے مال کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے خرچ کر کے خود اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا، انسان کے دل سے مال کی محبت کو فنا کر دیتا ہے۔ دولت اس کے نزدیک مقصودِ زندگی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس سے انسان اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ رزق کے سرچشمے تمام افرادِ انسانیہ کے لئے مساوی طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔

دل ز حَتّٰی تُنفِقُوا محکم کند
زر فزاید الفت زر کم کند

قرآن کا ارشاد ہے کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۲) تم کشادگی کی راہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تاوقتیکہ تم ان چیزوں کو جو تمہارے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں، نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلا نہ رکھو۔ غور کیجئے کہ یہ تعلیم انسان کے دل سے زر و سیم کی محبت کو ختم کر کے اس میں کس قدر لا انتہا وسعتیں پیدا کر دیتی ہے۔

یہ ہیں نظامِ اسلامی کے چند موٹے موٹے احکام۔ غور کیجئے کہ ان کی اطاعت سے انسان میں کس قدر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تُست
پختۂ محکم اگر اسلامِ تُست

یہ تمام چیزیں خود تیری خودی کے استحکام کا موجب ہیں۔ لیکن تو محکم اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب تیرا اسلام محکم ہو۔

اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

تو "یا قوی" کے ورد سے اپنے اندر قوت پیدا کر۔ اسی قوت کے ذریعے تو اپنے نفس کو اپنے تابع کر سکیگا۔

"وردِ یا قوی" کے معنی یہ نہیں کہ صبح کو اٹھ کر نماز کے بعد یا قوی یا قوی کا ورد شروع کر دیا جائے۔ صفاتِ خداوندی (اسماء حسنیٰ) کے ورد اور ذکر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر ان صفات کو منعکس کرتا چلا جائے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر فردِ انسانیہ

ہر ابن آدم کے اندر "روح خداوندی" پھونک دی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے اندر حد بشریت کے مطابق، صفات خداوندی کی صلاحیت مضمر طور پر رکھ دی گئی ہے۔ یہ صلاحیت مناسب تعلیم و تربیت سے مضمر (POTENTIAL) سے مشہود (CONCRETE) ہو جاتی ہے۔ اسلام اس نظام یا معاشرہ کا نام ہے۔ جس کے اندر انسان کی یہ صلاحیتیں مشہود سپیکر اختیار کر لیتی ہیں یعنی اس کے اندر ودیعت کردہ صفات خداوندی، کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ قوت بھی صفت خداوندی ہے۔ قرآن نے خدا کو قوی عزیز کہا ہے۔ یعنی غلبہ و قوت کا مالک۔ لہٰذا ورد یا قوی کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان قرآنی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اپنے اندر غلبہ و قوت پیدا کرتے چلے جائیں۔ یعنی اس صفت خداوندی کو جو ان کے اندر مضمر صورت میں موجود ہے، بیدار کرتے چلے جائیں۔ جب فرد میں یہ قوت بیدار ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لئے ضبط نفس نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب انہی افراد کا مجموعہ (یعنی جماعت) میں اس صفت کی نمود ہوتی ہے تو باطل کی ہر قوت اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔

اقبال اور قرآن

از: پرویز

- اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا
- قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے!
- ان کے جوابات مفسر قرآن اور ترجمانِ اقبال جناب پرویز سے سنئے

صفحات ۲۵۶ · قیمت دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ایل۔ ۳/۱۵۹، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی ۲۹

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۲)

[اس مضمون کی پچھلی قسط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور قرآن کریم کی رُو سے اس ضمن میں اولاد کے کیا فرائض وواجبات ہیں۔ موجودہ قسط میں یہ بتایا جائے گا کہ والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں خود ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔]

اَولاد

اولاد کے ساتھ ماں باپ کے تعلق کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی جبلت سے ہے۔ مثلاً اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنا۔ ان کی پرورش کرنا۔ ماں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانا۔ باپ کا ان کے کھانے کپڑے کے لئے جگر پاش مشقتوں کو برداشت کرنا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر انسان میں جبلی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ تقاضے کچھ انسانی جبلت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ حیوانات تک میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اولاد کی پرورش میں ان تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ چڑیا کی ننھی سی جان کو دیکھئے۔ وہ اپنے بچوں کی حفاظت وصیانت کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتی ہے۔ اس چھوٹی سی مرغی کو دیکھئے جس نے ابھی ابھی بچے نکالے ہوں۔ چیل یا کوّے کا سایہ بھی کہیں نظر آتا ہے تو وہ عقاب کی طرح دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ اور اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو سمیٹ لیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے صبح صبح دانہ دنکا اکٹھا کرنے کے لئے نکل جاتے ہیں وہ یہ چیزیں جمع کرکے لاتے ہیں اور چونگے کی شکل میں اپنے ننھے منے بچوں کے منہ میں انڈیل دیتے ہیں۔ یہی حال چوپایوں اور دوسرے جانوروں کا بھی ہے۔ یہ گوشہ چونکہ انسانی بلکہ حیوانی جبلت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی ہدایت کی ضرورت ہی نہیں۔ جس طرح

بکری کو کوئی یہ نہیں سکھاتا کہ جب اس کا بچہ پیدا ہو تو وہ اسے کس طرح دودھ پلائے۔ اسی طرح کسی لڑکی کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جب اس کے بچہ پیدا ہو تو وہ اس کو دودھ پلائے اور سردی و گرمی سے اس کی حفاظت کیا کرے۔ اس کے لئے تعلیم و ہدایت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لڑکی جب جوان ہوگی اور اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس کی جبلت اسے خود ہی بتا دے گی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے اس گوشہ سے متعلق زیادہ ہدایات دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ اس جبلی تقاضہ میں بھی چونکہ افراط اور تفریط ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی حدود ضرور مقرر کر دی ہیں۔

اس تعلق کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کی جبلت سے نہیں ہے۔ مثلاً بچہ اگر بے راہ روی اختیار کرنے لگے تو والدین کو اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اس کی تعلیم و تربیت کس طریقہ پر کرنی چاہیئے۔ اس کی کن صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے دلوں میں اپنے بچوں کے لئے کس قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں رکھنی چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ انسان بسا اوقات جذبات کی رَو میں غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اولاد کی بے جا اور غلط محبت اکثر اسے غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ زندگی کے اس گوشہ کے متعلق انسان کو وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ اور قرآن کریم نے اس ضمن میں ہمیں کافی ہدایات دی ہیں۔

اولاد کی خواہش معیوب نہیں

ہر انسان کو فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اولاد ہو اور وہ اس کو پرورش کرے آپ نے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو دیکھا ہوگا کہ جونہی وہ چار پانچ سال کی ہوتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی گڑیاں گودوں میں لے کر گھومنے پھرنے لگتی ہیں۔ کسی کو اگر گڑیاں نہیں ملتیں تو اپنے تکیوں ہی سے اپنے اس تقاضے کو پورا کر لیتی ہیں۔ ذرا اور بڑی ہوتی ہیں تو وہ گڑیوں کے شادی بیاہ کا ڈھونگ رچانے لگتی ہیں۔ بہرحال انسان کا یہ جذبہ بالکل فطری ہے جسے معیوب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خواہش بڑے بڑے انبیاء تک کو بھی ہوئی ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس آرزو کا اظہار جنابِ باری میں بھی کیا ہے چنانچہ قرآن کریم نے حضرت زکریا کی اس دعا کو اپنے دفتین میں محفوظ کیا ہے۔ جس میں وہ عرض کرتے ہیں۔

وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (۱۹/۵-۶)

مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا مجھے اپنے پاس سے ایک ایسا مددگار عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا جانشین ہو۔ اور خدایا! اسے پسندیدہ صورت و سیرت کا مالک بنا۔

اولاد کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری تقاضا ہے۔ جو انبیائے کرام تک میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اسے معیوب نہیں کہا جا سکتا

اولاد کو حیاتِ جاوید کا ذریعہ سمجھنا غلط ہے

البتہ یہ سمجھنا کہ میں تو کچھ عرصہ کے بعد مر جاؤں گا۔ میرا نام میرے بعد میری اولاد کے ذریعہ سے ہی چلے گا۔ یہ غلط ہے۔ اس خیال کے دونوں

مقدمے غلط ہیں۔ یہ مقدمہ بھی غلط ہے کہ میں تو کچھ عرصے کے بعد مرجاؤں گا۔ کیونکہ انسان کی زندگی حیات دنیوی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔ زندگی ایک جمے رواں ہے جو اس زندگی کے بعد بھی چلتی ہے۔ موت اس کو ختم نہیں کردیتی۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ زندگی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد یہ دوسرا مقدمہ بھی غلط ہے کہ میرے بعد میرا نام میری اولاد کے ذریعے چلے گا انسان کا نام اس کی اولاد کے ذریعے سے نہیں چلتا بلکہ اس کے صلاحیت بخش اعمال کے ذریعے سے چلتا ہے۔ یہی وہ فریب تھا جو ابلیس نے آدم کو دیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ (۲۰/۱۲۰-۱۲۱)

ابلیس نے کہا۔ اے آدم! میں تجھے حیات جاوید کے درخت کا پتہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت کا نشان دیدوں جو کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت سے کھایا ہی تھا کہ دونوں کا جنسی شعور بیدار ہوگیا۔ اور دونوں اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے لگے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ راستے سے بھٹک گیا۔

انسان میں حیات جاوید کی تمنا ابتدا سے چلی آرہی ہے۔ اور یہ کوئی معیوب خواہش نہیں۔ لیکن حیات جاوید حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے صلاحیت بخش اعمال سے اپنی ذات یعنی نفس انسانی (PERSONALITY) کو اتنا مستحکم کرے کہ موت کا ہاتھ اس کو ختم نہ کرسکے۔ حیات جاوید حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان اولاد پیدا کرلے اور پھر اولاد کے ذریعہ سے اپنا نام چلانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ساری مفاد پرستیاں اور ذخیرہ اندوزیاں اسی جذبے کے ماتحت فروغ پاتی ہیں۔ تحفظ خویش انسان کا فطری تقاضا ہے۔ وہ اولاً براہ راست اپنے تحفظ کے لئے اور پھر اولاد کے ذریعے اسی اپنے تحفظ کے لئے ذخیرہ اندوزیاں اور سرمایہ داریاں اور جاگیرداریاں شروع کردیتا ہے۔ جس سے انسانیت میں بے شمار فتنوں اور ناہمواریوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اور بالیدگی ذخیرہ اندوزیوں سے نہیں ہوتی بلکہ اِنْفَاق اور دوسرے انسانوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے سے ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ (۹۲/۵-۱۰)

جو دیتا ہے اور قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ یعنی توازن بدوش انسانیت کے نظریہ کو سچ کر دکھاتا ہے تو ہم اس کے لئے سہولتوں اور آسانیوں کے لئے دروازے کھولدیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بخل کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مالدار بننے کی خواہش کرتے ہیں اور توازن انسانیت کو غلط کر دکھاتے ہیں۔ ان کے لئے ہم دشواریوں کی راہیں کھول دیتے ہیں۔

بہرحال اولاد کی خواہش پیدا ہونا معیوب نہیں. البتہ اس کے ذریعہ سے حیاتِ جاوید حاصل کرنے کی خواہش رکھنا غلط ہے. اولاد کی خواہش تو حیوانی جبلّت کا بھی تقاضا ہے. مگر ان کے ہاں چونکہ یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اولاد کے ذریعہ سے ان کا نام چلے گا. اس لئے نہ وہ ذخیرہ اندوزیاں کرتے ہیں اور نہ سرمایہ داریوں اور جاگیرداریوں کو پیدا کرتے ہیں. لہٰذا اولاد کی خواہش میں کوئی برائی نہیں. مگر اس کو حیاتِ جاوید کا ذریعہ سمجھنے میں یقیناً برائی ہے.

اولاد خدا کی نعمت ہے

انسان کو خدا کی طرف سے اولاد مل جانا خدا کا بڑا انعام ہے جس کی ہمیں ناشکری نہیں کرنی چاہیئے تکمیل مقصد انسانیت کے لئے بقائے نسل انسانی ضروری ہے. ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری یہ اولاد انسانیت کی نشوونما اور ارتقاء کا ذریعہ بنے. اور اس سلسلہ میں جو کام ہم مکمل نہ کر سکیں. اسے ہماری اولاد پایۂ تکمیل تک پہنچائے.

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ
بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ هُمْ
يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ (۱۶/۷۲)

اور اللہ نے تمہارے ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے. اور تمہاری بیویوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے (اور دوسرے مددگار) پیدا کئے اور خوشگوار چیزیں تمہیں بطور رزق کے عطا کیں. کیا وہ لوگ باطل توہمات پر تو یقین رکھتے ہیں. اور اللہ کی ان نعمتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں؟

اور رحمت بھی

اولاد خدا کی نعمت ہی نہیں بلکہ اس کی رحمت بھی ہے. یعنی بچے کی پرورش کا سامان بھی خود رزاق کائنات کی طرف سے مہیا ہوتا ہے. اسی کو رحمت کہتے ہیں خواہ یہ جسمانی نشوونما کے لئے ہو یا انسانی ذات کے استحکام و ارتقاء کے لئے. جہاں تک بچہ کی جسمانی پرورش کا تعلق ہے ذرا غور کیجئے کہ رحمِ مادر کے اندر جنین کس طرح قانونِ خداوندی کے تابع پروان چڑھتا ہے. ماں کے رحم میں اس کی ضروریات خدا کس طرح مہیا کرتا ہے. تاآنکہ وہ ایک مدت معینہ کے بعد ایک جیتا جاگتا مکمل بچہ بن جاتا ہے. پھر وضع حمل کے مرحلہ سے گذر کر جب وہ ماں کی گود میں آجاتا ہے تو روشنی، ہوا، پانی اور ماں کی چھاتیوں میں دودھ کس طرح اس کے لئے چشم براہ بلکہ دست بستہ حاضر ہوتے ہیں. مختلف مرحلوں میں اس کے تقاضے کس قدر مختلف ہوتے ہیں مگر ہر مرحلہ پر خدا کی نعمتوں کا خوانِ یغما کس طرح اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے. حتیٰ کہ وہ جوانِ رعنا ہو جاتا ہے. ذرا غور کیجئے کہ ان تمام مراحل میں انسان نے کیا کچھ کیا. اور خدا کی شانِ رحمت نے اس میں کتنا کچھ حصہ لیا ہے.

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاۗءً
خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ .... فَهَبْ لِىْ

مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ (۱۹/۵-۶)

یہ تیرے پروردگار کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی تھی۔ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ سے پکارا۔ اس نے کہا اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور سر بڑھاپے سے سفید ہو چکا ہے۔ میں آج تک کبھی تجھے پکار کر محروم نہیں رہا مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا تو مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرما!

آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں حضرت زکریاؑ کی دعا پر ان کو یحییٰ جیسا بیٹا عطا فرمانے کو رحمت ربانی قرار دیا گیا ہے۔

دنیوی زندگی میں اولاد تقویت کا باعث ہے

اولاد خدا کی نعمت اور رحمت اس لئے ہے کہ اس سے اس دنیا میں ہمیں تقویت حاصل ہوتی ہے ہماری کارکردگی کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ جب سے انسان نے منزل انسانیت میں قدم رکھا ہے۔ گھر کی زندگی (FAMILY LIFE) اس کا مستقل شعارِ حیات رہا ہے۔ یہ اس سے کسی دور میں بھی مستغنی نہیں ہوا۔ اس طرز زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی اولاد اس کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ اس لئے آپس میں ایک دوسرے سے تقویت محسوس کرتے ہیں ابتدائی دور کی قبائلی زندگی میں افراد خاندان کی کثرت خاص طور پر وجہ تقویت ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (۷۱/۱۰-۱۲)

میں نے ان سے کہا کہ خدا سے اس کے قانونِ ربوبیت کے مطابق سامانِ حفاظت طلب کرو بلاشبہ وہی سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔ وہ تم پر بارش کی دھاریں چھوڑ دے گا اور اموال و اولاد سے تمہاری تقویت کا سامان کرے گا۔ اور تمہارے لئے باغات اور نہریں بنا دے گا۔

قوم بنی اسرائیل کے متعلق بھی یہی فرمایا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ (۱۷/۶)

پھر تمہارے مخالفین کے خلاف ہم تمہاری باری دوبارہ لے آئے اور ہم نے اموال و اولاد

سے تمہاری تقویت کا سامان کر دیا۔ اور ہم نے تمہیں کثیر انبوہ والا بنا دیا۔

قوم عاد کو خطاب کرتے ہوئے حضرت ہودؑ نے بھی یہی فرمایا تھا۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّکُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ (۲۶)

اس خدا کے قانون سے ہم آہنگ رہو جس نے تمہاری تقویت کے وہ وہ سامان کئے جو تم جانتے ہو۔ اس نے چوپایوں اور اولاد سے اور باغات اور پانی کے چشموں سے تمہاری تقویت کے سامان بہم پہنچائے۔

بہرحال عائلی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے کہ ماں، باپ اپنی اولاد کے وجود سے ایک خاص قسم کی تقویت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ان کی خاندانی قوت و شوکت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

اولاد زینت کا باعث ہے

زینت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو لوگوں کو دیکھنے میں بھلی معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر جو اپنے مکینوں سے بھرا ہوا ہو۔ جس میں بچوں کی چہل پہل ہو۔ وہ ہر دیکھنے والی نگاہ کو بہ نسبت ایک اجڑے ہوئے گھر کے زیادہ خوش آئند نظر آئے گا۔ یہ تو گھر کی بات تھی۔ اگر نگاہوں میں ذرا اور وسعت پیدا کر کے دیکھا جائے تو درحقیقت ساری دنیا کی زینت بھی اولاد سے (یعنی بقائے نسل انسانی) ہی سے وابستہ ہے۔ اگر انسانی نسل کا انقطاع ہو جائے تو دنیا کی زندگی ہنگاموں سے قطعاً خالی ہو جائے۔ دنیا کی گردش لیل و نہار میں رنگینی ہے تو اسی کے دم قدم سے ہے۔ بازارِ حیات میں چہل پہل ہے تو اسی کے طفیل ہے۔ یہ نہ ہو تو دنیا پر ایک مرگ آسا خاموشی چھا جائے۔ اور حرکت و اضطراب کی جگہ سکوتِ مرگ لے لے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا ۝ (۱۸/۴۶)

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ لیکن تیرے پروردش دینے والے کے قانون کے نزدیک وہی اموال اور اولاد بہتر ہیں جو اپنے نتیجہ اور توقعات کے اعتبار سے باقی رہنے والے اور صلاحیت بخش ہوں۔

حیاتِ دُنیوی کے اعتبار سے یوں تو ہر اولاد باعثِ زینت ہے۔ لیکن خدا کے قانون میں وہی اولاد بہتر کہی جا سکتی ہے جو اس دنیا پر اچھے اور صلاحیت بخش اثرات چھوڑ جائے۔ لہٰذا ہمیں یہ مقصد ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ دنیا پر باقی رہنے والے اثرات چھوڑ کر جائے۔ اور وہ اثرات ایسے ہوں جو ہر اعتبار سے صلاحیت بخش ہوں۔ اگر ہم یہ نہیں کر سکے تو تو ہم نے اپنا انسانی فریضہ ادا نہیں کیا۔ فقط حیوانی جبلت کے تقاضوں کو پورا کیا۔ ظاہر ہے کہ انسانیت کو ہماری برخود غلط اولاد کے

ہاتھوں اگر شدائد و مصائب سے دوچار ہونا پڑا تو وہ رہتی دنیا تک ہم پر لعنتیں بھیجے گی۔ اور اگر سے اس کے ہاتھوں آرام اور سکون مل سکا تو وہ برابر ہمارے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کرتی رہے گی۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنی اولاد کو ایسا اٹھائیں جو سوسائٹی کے اچھے فرد اور دنیا کے بہترین شہری بن سکیں۔ جن سے انسانیت کی گاڑی پیچھے ہٹنے کے بجائے میدانِ ارتقا میں آگے بڑھے۔ یعنی وہ انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لئے کچھ عملی طور پر کر سکے۔

اولاد سے محبت فطری تقاضا ہے

"اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان سے محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ ملا کے مذہب میں اولاد ایک حد تک قابل نفرت چیز ہے۔ جس سے ہمیں محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اولاد ارشاد خداوندی کے مطابق زینت بڑی دنیوی زندگی کی اور دنیا ملا کے نزدیک مردار ہے۔ اور اس کے طلبگار اور متلاشی کتے ہیں۔ تو جو خود ہی مردار ہے اس کی زیب و زینت بھی مردار ہوگی اور کسی مردار چیز سے محبت کرنا کس طرح محمود ہو سکتا ہے مگر یہ تعلیم قطعاً قرآن کے خلاف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اول تو دنیا اور اس کی زیب و زینت کو حرام کس نے قرار دیا ہے تحریم و تحلیل کا حق تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اگر خدا نے حرام قرار دیا ہے تو بتاؤ کہاں حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر تم یہ نہیں بتلا سکتے تو ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں خدا کی طرف منسوب کیوں کرتے ہو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۳۲)

اے پیغمبر! کہدو کہ خدا کی اس زینت و آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اور خوشگوار رزق کی چیزوں کو آخر کس نے حرام کر دیا ہے؟ اے پیغمبر تم کہدو کہ دنیوی زندگی میں بھی یہ انہی لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لاتے ہیں اور قیامت کے دن تو یہ خاص انہی کا حصہ ہوگا۔ ہم اس طرح اپنی آیات کو نکھار نکھار کر ان لوگوں کے لئے بیان کر دیتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

لہٰذا دنیا اور اس کی زینت کی چیزیں نہ حرام ہیں اور نہ مردار اور نہ ہی ان سے محبت کرنیوالے کتے ہیں۔ یہ لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں۔ جو انھوں نے خود ہی گڑھ لی ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی محبت ایک فطری تقاضا ہے جسے نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے مطلقاً مذموم قرار دیا جا سکتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ

اَلْمَاٰبِ ۝ (۱۴/۳)

انسانوں کے لئے عورتوں، اولاد، سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، چوپاؤں اور کھیتی باڑی وغیرہ کی محبت کو مزین کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے انسان دنیوی زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ واضح رہے کہ بہتر نتائج خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتے ہیں۔

ان چیزوں کی محبت انسان کے دل میں خوشنما بنا کر فطری طور پر ڈال دی گئی ہے۔ اور خدا نے ہی ڈالی ہے۔ اس لئے اسے مطلقاً مذموم اور معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس نے اس محبت کی جو حدود مقرر کر دی ہیں۔ انسانوں کو اس سے متجاوز نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی محبت قطعاً محمود ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی بازپرس یا ملامت نہیں کی جا سکتی۔

اولاد انسانی کردار کی کسوٹی ہے

اولاد تو ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا اپنا کردار کس حد تک مستحکم ہوا ہے۔ اگر وہ خدائی حدود کے اندر اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے تو وہ کوئی برائی نہیں کرتا۔ لیکن اگر اولاد کی محبت کے جذبات اس قدر غالب آ جاتے ہیں کہ وہ اسے حدود شکنی پر مجبور کر دیتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا کردار مستحکم نہیں ہوا۔ اور کردار کی ناپختگی یقیناً قابل گرفت ہو گی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (۸/۲۸)

اے خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اجر عظیم خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتا ہے۔

"فِتْنَةٌ" کا لفظ عربی زبان میں ابتلاء، امتحان، آزمائش وغیرہ کے لئے آتا ہے۔ یہ لفظ "فَتَنٌ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی سونے چاندی کو آگ پر اس مقصد سے پگھلانے کے ہوتے ہیں کہ کھوٹ الگ ہو جائے اور خالص سونا اور چاندی الگ ہو جائے۔ لہٰذا فتنہ کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھئے اور "فتنہ" کے اُس مفہوم سے دھوکہ نہ کھایئے جو ہمارے ہاں اردو میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس آیت کو ہمارے ہاں عموماً مال اور اولاد کی مذمت کے لئے بطور شہادت کے پیش کیا جاتا ہے۔ فتنہ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں اردو میں مروج ہو وہ عربی کا مفہوم نہیں ہے۔ آیت کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ اموال اور اولاد تمہارے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کا ایک ذریعہ ہیں۔ جو لوگ اقدار دحی پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور حدودِ الٰہیہ کے اندر اپنی زندگی اور اس کے تقاضوں کو محدود رکھتے ہیں۔ ان کو اموال و اولاد کے ذریعہ سے ایسے لوگوں سے ممتاز کر کے الگ کر لیا جا سکتا ہے جو اقدار دحی پر مکمل ایمان نہیں رکھتے۔ اور حدود الٰہیہ کے تابع اپنی زندگی بسر نہیں کرتے۔ خدا کی مقرر کردہ حدود اور اولاد و اموال کی محبت میں جہاں تصادم ہو گا۔ وہیں انسان کے اپنے کردار کی پرکھ ہو جائے گی۔ اگر اس تصادم کی صورت میں بھی وہ حدود الٰہی اور اقدار دحی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہ اس بات کی شہادت

ہوگی کہ وہ ان حدود اور اقدار پر صحیح اور مکمل ایمان رکھتا ہے۔ اور اگر وہ اولاد اور اموال کی محبت کی طرف جھک جاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ ابھی اس کو خدا کی حدود اور اقدار پر مکمل ایمان حاصل نہیں ہو سکا۔

اولاد کی محبت قانونِ خداوندی پر غالب نہ آجائے

سطورِ بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ اولاد کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جو معیوب یا مذموم نہیں مگر اس کی کچھ حدود ہیں۔ سب سے بڑی حد تو یہ ہے کہ اولاد کی محبت کو قانونِ خداوندی پر غالب نہ آجانا چاہیئے۔ جہاں قانونِ خداوندی اور اولاد کی محبت میں ٹکراؤ اور تصادم کی نوبت آجائے۔ وہاں ہمیں ہمیشہ اولاد کی طرف نہیں بلکہ قانونِ خداوندی کی طرف ہی جھکنا چاہیئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۶۳/۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہیں خدا کے قانون کی پاسداری سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یقیناً نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

اگر اولاد کی محبت قانونِ خداوندی کی اطاعت میں حائل اور حارج ہو جاتی ہے۔ تو یہ محبت اپنی حدود سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اور اس لئے مذموم ہو جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (۶۴/۱۴-۱۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولادیں تمہارے لئے دشمن ہو جاتی ہیں۔ اللہ سے بچتے رہو۔ اگر تم عفو و درگذر اور فروگذاشت سے کام لو تو یقیناً خدا بڑا ہی فروگذاشت کرنیوالا اور مہربان ہے۔ یاد رہے تمہارے یہ اموال اور اولاد تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں۔ اور اللہ کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی اجرِ عظیم مل سکتا ہے۔

ایسی اولاد جو تمہیں حدودِ خداوندی سے تجاوز پر مجبور کرے۔ اور جس کی وجہ سے تم اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ نہ رہ سکو۔ تمہارے لئے باعثِ رحمت نہیں بلکہ موجبِ زحمت ہے۔ وہ تمہاری دوست اور خیر خواہ نہیں بلکہ تمہاری دشمن ہے۔ یہی موقعہ ہے جہاں تمہاری سخت آزمائش ہوتی ہے کہ ایسے موقعہ پر تم قانونِ خداوندی کی پیروی کو ترجیح دیتے ہو یا جذباتِ محبت کی رو میں بہہ جاتے ہو۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ

وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۨاقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ

جِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۹/۲۴)

اے پیغمبر! کہدو کہ اگر تمہارے باپ بیٹے، بھائی، بیویاں اور خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑجانے کا اندیشہ ہے۔ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں تمہارے نزدیک خدا، اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو کہ خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ یاد رہے کہ خدا ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو صحیح راستے سے کترا کر نکل جانا چاہتے ہوں۔

ہر ذا قانونِ خداوندی سے اگر اولاد کی محبت ٹکرائی ہے تو ایسے موقع پر ہمیں اولاد کی محبت کو لامحالہ خیرباد کہدینا ہوگا۔ کیونکہ ایمان کی تو شرط ہی یہ ہے کہ ہر قیمت پر قانونِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خواہ اس کی زد ہمارے ماں باپ پر پڑتی ہو یا اولاد پر۔ اس کی زد اپنے بیوی پر پڑتی ہو یا خود اپنے نفس پر۔ جو شخص قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں ان رشتہ داروں کی محبت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ قرآن کی نگاہ میں مومن ہی نہیں ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ

وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم

بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ

حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۵۸/۲۲)

اے پیغمبر اسلام! تمہیں ایسے لوگ نہیں ملیں گے جو ایک طرف خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں اور دوسری طرف ایسے لوگوں سے محبت بھی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں۔ خواہ ایسے لوگ ان کے ماں باپ، بیٹے بھائی یا اہلِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کی دولت لکھدی ہے۔ وہ اپنی طرف سے وحی خداوندی کے ذریعہ سے ان کی تائید و نصرت کرتا ہے۔ اور انھیں ایسے سدا بہار باغات میں داخل کر دیتا ہے۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان سے راضی رہتا ہے اور وہ خدا سے راضی رہتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں اور واضح رہے کہ اللہ کی پارٹی ہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

ایک مومن کے دل میں قوانین خداوندی کی کشش وجاذبیت کے ساتھ ایسی اولاد کی محبت یکجا ہو ہی نہیں سکتی۔ جو ان قوانین کے خلاف جا رہی ہو۔ ایک دل میں یا تو خدا اور اس کے رسول کی محبت سما سکتی ہے اور یا اس کے مخالفین کی محبت۔ دونوں کی محبتیں بیک وقت ایک دل میں سما ہی نہیں سکتیں۔

والدین کو یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ خدا کی نافرمان اولاد ایک مومن کے خاندان کا فرد ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر تمہاری اولاد خدا کی مطیع وفرمانبردار نہیں تو تمہارا اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) تمہاری اولاد ہو سکتی ہے مگر تمہارے اہل میں سے ہرگز نہیں کہی جا سکتی۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (۱۱ / ۴۵-۴۶)

اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا۔ خدایا میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے تھا۔ اور تیرا وعدہ (کہ میرے اہل وعیال طوفان سے محفوظ رہیں گے) تو سچا تھا اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنیوالا ہے (پھر میرا بیٹا طوفان میں کیوں غرق ہو گیا) خدا نے جواب دیا۔ اے نوح! تمہارا وہ بیٹا تمہارے اہل میں سے نہیں تھا۔ وہ غیر صالح اعمال کا مرتکب تھا (پھر وہ تمہارے اہل میں سے کیسے ہو سکتا ہے) تم مجھ سے ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جاہل لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس واقعہ کو بیان کر کے قرآن کریم نے اپنے اور پرائے کی وہ تفریق کر دی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اپنا وہ ہے جو تمہارے نظریۂ زندگی یعنی (IDEOLOGY) میں تمہارا ساتھی ہو۔ اور تم سے متفق ہو۔ جو تمہارے نظریۂ زندگی میں تمہارا ساتھی نہیں، وہ تمہارا اپنا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ تقسیم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ نسل، رنگ، خون، زبان، ملک اور زمین کی اپنائیت سے کوئی اپنا نہیں بن جاتا۔ نسلی اعتبار سے بیٹے کے مقابلہ میں اور کون اپنا ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن کی نگاہ میں جب بیٹا بھی نظریۂ حیات کے اعتبار سے باپ سے الگ راہ اختیار کر لے تو وہ بھی اپنا نہیں رہتا بلکہ وہ ہزار بیگانوں کا ایک بیگانہ بن جاتا ہے۔

اس حقیقت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور بھی واضح کر دیا ہے جہاں انھوں نے جناب باری میں یہ دعا مانگی ہے کہ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۱۴/۳۵-۳۶)

یاد کرو جب ابراہیم نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ اے پروردگار اس شہر کو پرامن شہر بنا دے۔ اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھنا۔ خدایا ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد جو میری پیروی کرے گا وہ میری اولاد ہوگا اور جو میری نافرمانی کیے گا (تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) البتہ خدایا تو سامان حفاظت عطا کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صاف وضاحت کے ساتھ فرما دیا ہے کہ میری اولاد میں سے جو میرا مطیع ہوگا وہ تو میری اولاد ہے۔ اور جو میرا مطیع و فرمانبردار نہیں ہوگا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ البتہ یہ نیک آرزو ان کے لئے ضرور ہے کہ خدا انہیں سامان حفاظت اور مرحمت سے نواز دے۔ اور اس طرح ان کو ہدایت حاصل کرنے کی توفیق دیدے۔

اولاد کی صحیح تربیت

جہاں تک جسمانی تربیت کا تعلق ہے۔ یہ انسان کا جبلی تقاضا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی نشوونما کی فکر کرتا ہی ہے۔ مگر ماں باپ کا اتنا ہی فریضہ نہیں ہے کہ وہ ان کو جسمانی طور پر پال پوس کر جوان کر دیں یہ کام تو حیوانات بھی کر دیتے ہیں انسان کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں انسان بنائے۔ اس کی اخلاقی اور نظریاتی اعتبار سے ایسی تربیت کرے کہ وہ سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ اس کے اعمال و کردار پر نظر رکھے۔ اور جہاں دیکھے کہ وہ راستہ سے بھٹک رہی ہے فوراً انہیں ٹوکے اور صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی تنبیہ کرے۔

إِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کی ہستی کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

یہی کچھ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی تھی۔

وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۲/۱۳۲)

ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور پھر یعقوب نے بھی اپنی اولاد کو یہی وصیت کی تھی کہ میرے بیٹو! خدا

نے تمہارے لئے اس دین کو منتخب فرمایا ہے۔ لہٰذا تم صرف اسی حالت میں موت سے ہمکنار ہونا کہ تم اس کے پورے پورے مطیع اور فرمانبردار ہو۔

حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے آخری وقت تک بھی اس فریضہ سے بے توجہی نہیں برتی۔ چنانچہ جب کشتی میں سوار ہونے لگے اور بیٹا پیٹھ موڑ کر جانے لگا تو انہوں نے اس وقت بھی اس کو پکارا اور فرمایا۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا
وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ۝ (۱۱/۴۲)

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا، وہ الگ کو ایک کنارہ پر کھڑا ہوا تھا (نوح نے کہا) بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھی نہ بنو۔

اولاد کے لئے نیک آرزوئیں

والدین کو اپنی اولاد کے لئے ہمیشہ نیک آرزوئیں رکھنی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ اولاد کے لئے انسان کے دل میں یہ نیک آرزوئیں بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ ان کی اخلاقی اور نظری طور پر صحیح تربیت کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ اگر یہ جذبہ ہی ان کے دل میں نہ ہو تو اس قسم کی نیک آرزوئیں کہاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے جہاں بیٹے کی پیدائش کی دعا مانگی وہاں ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی۔

فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (۱۹/۵-۶)

خدایا مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرمادے جو میرا اور اولاد یعقوب کا وارث ہو اور خدایا اسے پسندیدہ صورت و سیرت کا مالک بنانا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا پہلے بھی گذر چکی ہے کہ انہوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي
وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ (۱۴/۳۵)

یاد کرو کہ جب ابراہیم نے عرض کیا تھا کہ خدایا اس شہر کو پرامن شہر بنا دینا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم بتوں کی پرستش میں لگ جائیں۔

حضرت مریم کی والدہ نے حضرت مریم کی پیدائش کے بعد بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا۔

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ
الرَّجِيمِ ۝ (۳/۳۶)

میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا ہے۔ اور خدایا! میں اس بچی کو اور اس کی اولاد کو

مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

بلکہ تمام نیک بندوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد اپنے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بھی بلند تر مقام کی ہو۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ

اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۲۵/۷۴)

اور (اللہ کے نیک بندے) وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں اور اولادوں میں سے ایسی بیویاں اور اولادیں عطا فرما جن سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ اور ہمیں ان لوگوں کا امام اور پیشوا بنا جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا چاہتے ہیں۔

ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح اسی پر منحصر ہے کہ آئندہ نسلیں صحیح بنیاد پر اٹھیں۔ کیونکہ انسانیت برابر ارتقائی مدارج طے کرتی چلی آرہی ہے اور اسے یہ ارتقائی منازل بہرحال طے کرنی چاہئیں۔ یہ ارتقاء تدریجی ہوتا آرہا ہے۔ اور تدریجی ہی ہونا ہے۔ ہر دور کی ایک منزل ہوتی ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج کی نسل کے وہ امکانات نہیں ہوسکتے۔ جو کل کو آنے والی نسل کے لئے ہوں گے۔ اگر ہماری آنیوالی نسل اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان حدود سے آگے قدم نہیں بڑھا سکی جن حد تک ہم آکر رک گئے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت کا ارتقاء رک گیا۔ اور وہ ایک نقطہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے جو کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں کہی جاسکتی۔ ہوتا یہی ہے کہ ہر نسل انسانی ارتقاء میں اپنی ممکنہ حد تک سعی کرتی ہے۔ اور آنیوالی نسل اسے اور آگے بڑھاتی ہے، تا آنکہ انسانیت کسی نئے انقلاب سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی انقلاب بڈھے بوڑھوں کے ہاتھوں نہ برپا ہو سکا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب ہمیشہ نئی پود اور جدید نسل (NEW GENERATION) کے ہاتھوں ہی برپا ہو سکا ہے۔

ذرا بنی اسرائیل کی مثال کو سامنے لائیے۔ یہ قوم کس قدر مصائب و آلام میں گرفتار تھی۔ ملوکیت و شہنشاہیت (فرعون) سرمایہ داری اور جاگیرداری (قارون) اور پیشوائیت اور برہمنیت (ہامان) کے تین زبردست پاٹ تھے جن کے درمیان میں صدیوں سے یہ قوم پستی اور کچلتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ ہر مصیبت اپنے نقطۂ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ فلسفۂ تاریخ کے لحاظ سے جس قدر شدید یہ قوتیں تھیں۔ اتنا ہی شدید ان کا ردِ عمل (RE - ACTION) بھی ہونا چاہیئے تھا۔ انقلاب کے لئے اس سے بہتر سازگار فضا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سرزمین میں جو انقلاب پیدا کیا۔ وہ اس قوم کے بڈھے بوڑھوں کے ہاتھوں رونما نہیں ہو سکا۔ جو ساری عمر ان ستمگاروں کی چکی کے پاٹوں پستے چلے آرہے تھے بلکہ

فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ

مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ٥ (۱۰/۸۳)

فرعون اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کے اس خوف کے باوجود کہ وہ انہیں کسی نئی آزمائش اور ابتلا میں نہ ڈال دے، موسیٰ پر اس کی قوم کی کچھ نئی پود ہی ایمان لا سکی تھی۔ فرعون یقیناً سرزمین مصر میں بڑی قوتوں کا مالک اور بڑا ہی ظالم بادشاہ تھا۔

چونکہ ارتقاءِ انسانیت کی گاڑی نئی پود کے بل بوتے پر ہی آگے چلتی ہے۔ اس لئے ہر نئی پود اور ہر نئی نسل کی حفاظت انتہائی ضروری ہو جاتی ہے۔ تاکہ اس کی صلاحیتیں کہیں دب کر نہ رہ جائیں۔ اگر نئی نسل کی صلاحیتیں برگ و بار نہ لا سکیں اور دب کر رہ گئیں تو انسانیت کی گاڑی جہاں کی تہاں رہ جائے گی۔ اور ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اس لئے ہر نسل کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنی آنیوالی نسل کی صحیح تربیت کر کے اس کی صلاحیتوں کو اتنا اجاگر کر دے کہ وہ انسانیت کی اس گاڑی کو اس منزل سے آگے لے جا سکیں جہاں موجودہ نسل اسے چھوڑ رہی ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم پوری انسانیت کو جحیم کے اس غار میں دھکیل دیتے ہیں جہاں انسانیت رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جحیم قرآن کی اصطلاح میں اس معاشرہ کا نام ہے جہاں کاروانِ انسانیت رک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ارتقائی مدارج طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ عربی زبان میں جَحَمَ کے معنی ٹھٹک جانے کے ہیں اور جحیم وہ ماحول ہے جہاں کوئی رک کر کھڑا ہو جائے اور آگے نہ بڑھ سکے۔

آنے والی نسل کو صحیح تربیت نہ دینا اور اس کی صلاحیتوں کو اجاگر نہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں نسل کشی کہلاتا ہے جو اتنا بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے ہاں اولاد کی طرف سے بے اعتنائی اور بے توجہی بڑی عام تھی۔ وہ اولاد کی پرورش کو اسی حد تک ضروری سمجھتے تھے جس حد تک حیوانی جبلت کے مطابق فطری طور پر وہ مجبور ہوتے تھے۔ جہاں بچہ اس قابل ہوا کہ وہ ادھر سے ادھر آ جا سکے اور کچھ کام دھندا کر سکے۔ وہ بالکل اس سے بے توجہ ہو جاتے تھے۔ بچہ جہاں آٹھ نو سال کا ہوا اور اس قابل ہوا کہ وہ جنگل میں جا کر اونٹ اور بکریاں چرا سکے تو وہ اس کی غور و پرداخت سے آزاد ہو جاتے تھے۔ یہ بچے اپنا پیٹ بھرتے بلکہ ماں باپ کے لئے بھی کچھ کما کر لانے کے لئے دوسروں کی نوکری اور مزدوری کرنے کے لئے نکال دیئے جاتے تھے۔ اولاد کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ ضرورت پڑتی تو وہ ان کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ سرمایہ دار یہودیوں کے ہاں چند دستی کھجوروں کے بدلے ان کو رہن بھی رکھ دیتے تھے۔ عرب معاشرہ کی یہ عام کیفیت تھی اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی یہ کیفیت ہو وہاں اولاد کی طرف ضروری توجہ اور ان کی صحیح تربیت کے خیال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم نے اس کو نسل کشی (قتل اولاد) سے تعبیر کیا ہے۔

باقی آئندہ

دمہ کی تیر بہدف دوا مفت

پتہ ذیل سے مل سکتی ہے

حاجی محمد دین صاحب، شیخ آلس فیکٹری۔ لارنس کوارٹرز۔ لارنس روڈ۔ کراچی

اسلام کی سرگزشت

اس سے پہلے اسلام پر دیگر اقوام وملل کے اثرات سے گفتگو کی جارہی تھی۔ چنانچہ پچھلی قسط میں ایران کے مذاہب میں سے زردشتی مذہب کے اثرات سے بحث کی گئی تھی۔ موجودہ اشاعت میں ایران کے دیگر مذاہب یعنی مانویت اور مزدکیت کے اثرات زیر بحث آرہے ہیں

(ب) مانی اور مانویت[1]

ایران کے مشہور ترین مذاہب میں سے جس کے متبعین بکثرت پائے جاتے تھے ایک مذہب مانویت بھی تھا۔ مانی — اس مذہب کے بانی — کی پیدائش جیسا کہ البیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیۃ" میں لکھا ہے ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں ہوئی تھی — ان مخالفتوں کے علی الرغم جو اس مذہب کو پیش آئیں — یہ مذہب ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی تک زندہ رہا۔ ایشیا اور یورپ میں اس کے متبعین بکثرت موجود تھے۔ دینی افکار و آرا میں بھی اس کا بڑا گہرا اثر تھا۔ مانویت کی تعلیمات، نصرانیت اور زردشتیت سے مخلوط تھیں۔ اس مذہب کو جیسا کہ پروفیسر براؤن کا خیال ہے — نصرانیت آمیز زردشتیت شمار کرنا زیادہ صحیح ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اسے زردشتیت آمیز نصرانیت شمار کیا جائے۔ اس مذہب کے متعلق عربی اور یورپین سرچشموں دونوں سے کافی مواد مل سکتا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس سلسلہ میں عربی سرچشموں کی توثیق کی ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ اس کے بارے میں عربی سرچشموں سے زیادہ اہم کتابیں یہ ہیں۔ ابن حزم کی الفصل فی الملل والنحل، شہرستانی کی الملل والنحل ابن الندیم کی الفہرست، یعقوبی کی تاریخ، البیرونی کی الآثار الباقیۃ، ابن نباتہ کی سرح العیون وغیرہ۔

ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا — جیسا کہ زردشت نے بھی کہا ہے۔ دو اصلوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ دونوں اصلیں نور اور ظلمت ہیں۔ نور سے ہر خیر اور اچھی چیز پیدا ہوئی ہے اور ظلمت سے ہر بری چیز پیدا ہوئی ہے۔ اور کوئی شر کے اوپر کوئی قدرت نہیں ہے اور ظلمت کو خیر کے اوپر کوئی قدرت نہیں ہے۔ انسان سے جو کچھ خیر صادر ہوتی ہے اس کا سرچشمہ الٰہ خیر ہوتا ہے۔ اور جو کچھ انسان سے شر صادر ہتا ہے۔ اس کا سرچشمہ الٰہ شر ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی کی طرف رحمت

---

[1] واضح رہے کہ مانی کی طرف نسبت کرتے ہوئے عرب لوگ کبھی تو "مانیۃ" کہتے ہیں اور کبھی "مانویۃ" کہتے ہیں۔ "مانویۃ" کے ساتھ نسبت کرکے متنبی نے بھی اپنے ایک شعر میں اسے استعمال کیا ہے جہاں اس نے کہا ہے ؎ وکم لظلام اللیل عندک من ید تخبر ان المانویۃ تکذب

کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ نظر خیر اور نور کی نظر ہوتی ہے۔ اور جب وہ کسی کی طرف سنگدلی اور قساوت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ نظر شر اور ظلمت کی نظر ہوتی ہے۔ یہی حال باقی تمام حواس کا ہے۔ اس دنیا میں خیر اور شر پوری طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل گئے ہیں اس کے بعد مانی اور اس کے اصحاب نے اس امتزاج و اختلاط کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ایسی ہے جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کو خرافات کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

ان تعلیمات میں ــــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ــــ زیادہ تر وہ زردشت کی تعلیمات سے باہر نہیں جاتا۔ لیکن اس کے بعد وہ ایک بنیادی نظریہ میں زردشت کے خلاف جاتا ہے۔ زردشت کی رائے یہ تھی کہ یہ موجودہ دنیا عالم خیر ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں شر کے اوپر خیر کی فتح مندی کے مظاہر اور آثار موجود ہیں۔ لیکن مانی کا یہ خیال ہے کہ اس دنیا میں خیر اور شر کا خود یہ امتزاج بھی ایک شر ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ اپنے نظریہ کے ماتحت زردشت کا خیال یہ تھا کہ انسان کو طبعی زندگی کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے چنانچہ اسے شادی کرنی اور اولاد پیدا کرنی چاہیئے۔ اپنی کھیتی باڑی کرنی اور جانوروں اور چوپایوں کی خبر گیری کرنا چاہیئے۔ اپنے بدن کو طاقتور رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ روزہ بھی نہیں رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان اس طریقہ پر زندگی بسر کر کے اہرمن (شر) کے مقابلہ میں اہورمزد (خیر) کی مدد کر سکتا ہے۔ لیکن مانی نے اس کے برعکس ایک دوسرا مسلک اختیار کیا جو رہبانیت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ مانی ــــ جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے ــــ حران کا ایک راہب تھا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس دنیا میں نور کا ظلمت کے ساتھ مل جانا خود ایک شر ہے چنانچہ اس نے اس بنا پر نکاح کرنے کو حرام قرار دیدیا۔ تاکہ فنا جلد آجائے اور زہد کی طرف لوگوں کو دعوت دینی شروع کر دی۔ ہر مہینہ میں سات دن کے روزے ہمیشہ کے لئے فرض کر دیئے۔ ایسے ہی بہت سی نمازیں بھی فرض کر دیں کہ آدمی کھڑا ہو۔ پانی سے وضو کرے اور سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے۔ قیام کرے۔ سجدے کرے۔ اس طرح بارہ سجدے کرے اور ہر سجدہ میں مقررہ دعا پڑھے۔ اس نے اپنے اصحاب کو جانور ذبح کرنے سے بھی منع کیا۔ کیونکہ اس میں جانوروں کو اذیت اور تکلیف دینا ہے۔ مانی نے حضرت عیسیٰ اور زردشت دونوں کی نبوت کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہی (یعنی مانی ہی) وہ نبی ہے۔ جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔

کہتے ہیں کہ ہرمز شہنشاہ ایران نے مانوی مذہب قبول کیا تھا جس سے اس مذہب کو بڑی تائید حاصل ہوئی۔ اور لوگ کثیر تعداد میں اس دین میں داخل ہو گئے۔ لیکن ہرمز کے مرنے کے بعد جب بہرام اول تخت نشین ہوا تو اسے اس کی تعلیمات نہیں بھائیں۔ اس نے مانی کو قتل کرا دیا اور اس کے ساتھیوں کو منتشر کر دیا تاہم ایسا کرنے سے اس کی تعلیمات مر نہیں گئیں۔ اس کے دین میں یکے بعد دیگرے برابر بڑے بڑے امام ہوتے رہے۔ امام کا مرکز ابتدءً بابل میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ سمرقند کی طرف منتقل ہو گیا۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ جب ایرانیوں کی حکومت میں انتشار آگیا اور عربوں کی حکومت نے قوت پکڑ لی تو مانی کے متبعین جو ایران سے روپوش ہو گئے تھے۔ وہ پلٹ کر ایران میں بس گئے ــــ خصوصیت کے ساتھ ایرانی فتنہ کے دوران میں اور بنو امیہ کے دور حکومت میں ــــ کیونکہ خالد بن عبداللہ القسری ان پر بڑا ہی مہربان تھا۔ آخری مرتبہ یہ لوگ مقتدر کے عہد حکومت میں بالکل ہی ایران سے چھٹ گئے اور خراسان میں ان لوگوں نے پناہ لی کیونکہ مقتدر کے عہد حکومت میں انھیں اپنی جانوں کا خوف تھا۔ جو لوگ ایران میں رہ گئے۔ وہ بھی اپنی مانویت کو چھپا کر رہتے تھے۔ ویسے یہ لوگ تمام اسلامی مقامات پر موجود تھے۔ خود مدینۃ السلام یعنی بغداد میں معزالدولہ کے زمانہ میں قریب تین سو آدمی ایسے تھے جنھیں میں خود اچھی طرح پہچانتا تھا کہ یہ مانوی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ آجکل پایۂ تخت میں ان کے شاید پانچ آدمی بھی نہ مل سکیں۔ اس کے بعد

ابن الندیم نے ان رؤسا کے نام گنائے ہیں جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن درحقیقت زندیق تھے۔ چنانچہ جعد ابن درہم کو جو مروان ابن محمد — بنو امیہ کے آخری خلیفہ — کا استاد تھا۔ ابن الندیم نے انہی لوگوں سے شمار کیا ہے۔ خالد بن عبداللہ القسری کے متعلق بھی لوگوں کو اس کے زندیق ہونے کا شبہ تھا۔ ایسے ہی بشار بن برد۔ سلم الخاسر صالح بن عبدالقدوس بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ لوگ کہتے ہیں خاندان بنو برمک میں سوائے محمد بن خالد بن برمک کے سب کے سب ہی زندیق تھے۔ بلکہ بعض اہل مذہب کے قلم سے لکھا ہوا ہیں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ مامون رشید بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ لیکن یہ غلط اور جھوٹ ہے۔ بہرحال آجکل ان کی ریاست سمرقند میں قائم ہے۔

یہ مذہب یورپ میں بھی جنوبی فرانس تک پھیلتا چلا گیا تھا چنانچہ لوگ کہتے ہیں سینٹ آگسٹین عرصہ دراز تک مانوی مذہب کے پیرو رہے ہیں۔ اور بعد میں انھوں نے نصرانی مذہب کو قبول کر لیا تھا۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی مانوی فرقہ ادبی حرکت کا محرک رہا ہے۔ انھوں نے بہت سے نئے مسائل پیدا کئے۔ اور اپنے ابتدائی عہد سے ہی مجادلہ اور مناظرہ میں مشغول رہے۔ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ موبذان کے سب سے بڑے موبذ (یعنی قاضی القضاۃ) نے مانی سے مناظرہ کیا۔ اور موبذ نے یہ سوال کیا: "کیا تم اس کے قائل ہو کہ نکاح اور شادی کرنا حرام ہے تاکہ دنیا جلد از جلد فنا ہو سکے؟" مانی نے جواب دیا کہ "قطع نسل کے ذریعے نور کی مدد کرنا تاکہ وہ ظلمت سے چھٹکارا حاصل کر سکے واجب ہے"۔ اس پر موبذ نے کہا کہ "پھر تو یہ ہمارا واجب فریضہ ہے کہ کم از کم تمہیں تو جلد از جلد وہ چھٹکارا دیدیا جائے۔ جس کی طرف تم لوگوں کو دعوت دیتے ہو اور اس مذموم امتزاج کو ختم کرنے میں تمہاری مدد کی جائے"۔ مانی اس جواب پر بھونچکا سا رہ گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ بہرام نے فوراً حکم دیا اور مانی کو قتل کر دیا گیا۔ ایسے ہی ایک دوسرا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مانوی مذہب کے پیرو سے مامون رشید نے مناظرہ کیا اور پوچھا۔ "کبھی گنا ہگار اپنے گناہوں پر کبھی شرمندہ ہوا ہے؟" مانوی نے جواب دیا "کیوں نہیں! بہت لوگ شرمندہ ہوئے ہیں"۔ مامون نے پوچھا تو پھر بتاؤ کہ بدعملی پر شرمندہ ہونا بدعملی ہے یا نیک عملی ہے؟ اس پر مانوی نے جواب دیا کہ "بدعملی پر شرمندہ ہونا نیک عملی ہے"۔ مامون نے کہا کہ "اس سے لازم آتا ہے کہ نادم ہونے والا وہی شخص ہوگا جس نے بدعملی کی تھی"۔ مانوی نے جواب دیا کہ "ہاں وہی شخص ہوگا"۔ مامون نے کہا کہ اس سے تو نظر آتا ہے کہ صاحب خیر ہی صاحب شر بھی ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تمہارا وہ دعوی تو ختم ہو گیا کہ جو شخص دھمکی کی نظر سے دیکھتا ہے وہ اس شخص کا غیر ہوتا ہے جو رحمت اور شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس پر مانوی نے کہا کہ "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جس شخص سے برائی سرزد ہوئی تھی وہ اس شخص کا غیر تھا۔ جس سے ندامت سرزد ہوئی"۔ مامون نے کہا کہ پھر یہ شخص کس بات پر نادم ہوتا ہے — آیا وہ ایک ایسی چیز پر نادم ہوتا ہے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوئی بلکہ کسی دوسرے سے سرزد ہوئی ہے۔ یا ایسی چیز پر نادم ہوتا ہے جو خود اسی سے سرزد ہوئی ہے؟۔

مانوی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور بغلیں جھانکنے لگا

مسلمانوں میں علم کلام کا ایک بڑا حصہ ان کی تعلیمات سے متعلق ہے۔ متکلمین ان کی آراء بیان کرتے ہیں اور پھر ان کا رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جو مانوی مذہب والوں نے پیدا کئے جیسے مثلاً معاد کے بارے میں یہ بحث کہ وہ اجسام کے ساتھ ہوگی یا ارواح کے ساتھ اس قسم کے نت نئے مسائل پیدا کرنے سے مقصد ہی تھا اور یہی ہوا کہ مسلمان بھی ان مسائل میں الجھ گئے اور کوئی کسی فرقہ کی طرف گیا اور کوئی کسی فرقہ کی طرف۔

یہاں دو مسئلے ایسے ہیں جن کی ہمیں تحقیق کرنی چاہیے۔

(۱) اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد مانوی مذہب کی اس قدر شدید مخالفت کیوں کی گئی۔؟

اس کا جواب اشارتاً ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ بہرام کو مانی اور اس کے اصحاب کے قتل پر جس چیز نے برانگیختہ کیا وہ زندگی کا عملی پہلو تھا۔ زردشت عمل کی طرف دعوت دیتا تھا۔ وہ اپنی تعلیمات میں قومیت اور جنگی رجحانات کی تائید کرتا تھا جو اس زمانہ کے ایرانی رجحانات سے بالکل مطابقت رکھتی تھی لیکن مانی کی تعلیمات اس کے برعکس تھیں۔ اس کا رجحان زہد، زندگی کے لذائذ سے نفرت اور جلد فنا ہو جانے کی خواہش کی طرف تھا۔ یہ تعلیمات ـــــ اس میں کوئی شبہ نہیں ـــ ایران جیسی جنگجو مملکت کے لئے خطرناک تھیں۔ اس کی تائید الآثار الباقیۃ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "بہرام نے کہا کہ یہ شخص تو دنیا کو برباد کرنے کی دعوت دینے کے لئے نکلا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ اپنے مقصد میں کچھ بھی کامیابی حاصل کر سکے ہم پر واجب ہے کہ سب سے پہلے ہم خود اس شخص ہی کو ختم کر دیں"۔

مگر اس پر اتنا اضافہ ضرور کر لیجئے کہ اپنی ان تعلیمات کے باوجود ـ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ـــ یہ لوگ اپنے مذہب کی طرف دعوت دینے میں بڑی کوششیں کرتے تھے اسلام اور نصرانیت کے پردوں میں چھپ چھپ کر بھی یہ لوگ اپنی دعوت اور تبلیغ جاری رکھتے تھے تاکہ اس طرح یہ لوگ مخالفت اور گرفت سے محفوظ رہ سکیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مانی کے متبعین کو اکثر زندیق کے لفظ سے موصوف کیا جاتا ہے۔ تو کیا یہ لفظ ان کے ساتھ کوئی خصوصیت رکھتا ہے۔؟

ابن الندیم کی عبارتوں سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ "زندیق" کا لفظ مانی کے اصحاب اور اس کے مذہب کے متبعین پر بولا جاتا ہے یعنی یہ کوئی عام لفظ نہیں ہے جو ہر کافر اور ملحد کے لئے بولا جاتا ہو۔

خیاط معتزلی نے بھی اپنی کتاب "الانتصار" میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص فرقہ ہے جو یہودیوں اور نصرانیوں سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ ابن الراوندی نے کہا ہے کہ ثمامہ کا یہ بیان ہے کہ اکثر یہود و نصاریٰ مجوسی۔ زنادقہ اور دہریئے قیامت کے دن خاک ہو جائیں گے اور جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے ..... الخ" خیاط نے اس لفظ کو اپنی کتاب میں پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ اور ہر جگہ کچھ اسی طرح سے استعمال کیا ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب "المعارف" میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے مذاہب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "نصرانیت ربیعہ غسان اور قضاعہ کے ایک حصہ میں تھی۔ اور یہودیت حمیر، بنو کنانہ، بنو حارث بن کعب اور کندہ میں تھی: مجوسیت بنو تمیم میں تھی! چنانچہ زرارہ، حاجب بن زرارہ اور اقرع بن حابس (تینوں تمیمی ہیں) مجوسی تھے اور زندقہ قریش میں تھا جو ان لوگوں نے حیرہ سے لیا تھا"۔ ابن قتیبہ کی اس تعبیر سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندقہ سے ان کی مراد ایران کے مذاہب میں سے کوئی خاص مذہب ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قریش نے زندقہ کو حیرہ سے لیا تھا اور یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ حیرہ ایرانی حکومت کے ماتحت ہی تھا۔ اس کے قریب قریب وہ بیان بھی ہے جو امام جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ "زندیق" ثنویت کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ معرب ہے جس کی جمع زنادقہ آتی ہے قَدْ تَزَنْدَقَ اس سے فعل اور زَنْدَقَةٌ اسم آتا ہے: اس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ زندقہ بھی یہودیت اور نصرانیت کی طرح کوئی خاص مذہب ہے اور عام طور پر الحاد اور بددینی کے معنوں میں اس کا استعمال ایک نئے معنے ہیں جو بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو زمانہ

کے بقاء کا قائل ہوتا ہے۔ یہ لفظ فارسی ہے اور زندگر کا معرب ہے۔ یعنی زمانہ کے بقاء کا قائل۔ احمد ابن یحییٰ نے کہا ہے کہ عربی زبان میں زندیق کا لفظ نہیں تھا۔ عرب لوگ جب اس مفہوم کو ادا کرنا چاہتے تھے تو "ملحد" یا "دہری" کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا زندقہ کا لفظ ہر ثنویت پر بولا جاتا ہے۔ یا ثنویت کے کسی خاص مذہب و مسلک مثلاً صرف مانویت پر؟ ابن قتیبہ کے کلام سے ایسا ہی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسی خاص مذہب پر ہی بولا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی عبارت میں زندقہ کے مقابلہ میں مجوسیت کا لفظ لائے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ قبیلۂ بنو تمیم مجوسی ہوگیا تھا۔ اور قبیلۂ قریش زندیق ہوگیا تھا۔ اگر زندقہ سے ان کی مراد محض عام ثنویت ہوتی تو پھر اس مقابلہ کے یہاں کوئی معنی نہیں بنتے۔ اس کی تائید صحاح کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جہاں جوہری نے کہا ہے۔ "زندیق، ثنویت کی ایک شاخ کا نام ہے۔" انھوں نے یوں نہیں کہا کہ زندقہ ثنویت کو کہتے ہیں۔ اب اتنی بات اور رہ گئی ہے کہ کیا یہ لفظ محض مانویت پر ہی بولا جاتا ہے؟ آلوسی نے ابن الکمال سے نقل کیا ہے کہ "یہ لفظ مزدکیت پر بولا جاتا ہے اور یہ کہ مزدک نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام زند تھا۔ اور یہ کہ مزدکیت مانویت کے علاوہ کوئی مذہب ہے" مگر یہ بیان قطعاً غلط ہے کیونکہ مزدک نے کوئی کتاب زند کے نام سے نہیں لکھی۔ بلکہ اس نے زردشت کی کتاب "اوستا" کی شرح لکھی تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ زندیق کے معنی فارسی زبان میں در اصل اس شخص کے ہیں جو "زند" کا اتباع کرتا ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ مانویت پر بولا جانے لگا۔ کیونکہ یہ لوگ بھی زند وغیرہ کتب مقدسہ کو تسلیم کرتے تھے اور اپنے مذہب کے مطابق تاویل کے طریقہ پر اس کی شرحیں کیا کرتے تھے۔ استاد "بیقان" کا بیان ہے کہ الفہرست (لابن ندیم) اور البیرونی کی عبارتوں سے ایسا نظر آتا ہے کہ مانوی فرقہ "سماعین" کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال کرتا تھا جو مانویت کے بلند درجہ تک ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان تمام واجبات کو ادا کرنے کا التزام نہیں کرتے تھے جو دین مانویت ان پر فرض کرتا تھا۔ مثلاً رہبانیت اور زہد وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں یہ لوگ "صدیقون" کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال کرتے تھے جو ان تمام واجبات کو ادا کرنے کا التزام رکھتے تھے۔ اور اس دین میں بلند مقام کے مالک ہوتے تھے یعنی فقر کو مالداری پر فضیلت دیتے اور دنیا اور دنیوی احوال و ظروف کی طرف کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ لفظ صدیق عربی کلمہ ہے جس کی آرامی اصل یعنی صدیقی (SADDI QAI) موجود ہے۔ اہل ایران نے اس لفظ کو لیا اور اپنے محاورے کے مطابق اسے زندیق کر لیا۔ انھوں نے مشدد دال (D D) کی جگہ نون اور دال کر لیا۔ جیسا کہ یہ لوگ سبّاذ (SABBATH) کو شنباذ (SHANBATH) کہدیا کرتے ہیں[1]۔ اس قول کی بناء پر یہ لفظ مانوی مذہب کے پیروکاروں کے ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص تھا مگر بعد میں تمام مانوی پیرؤں پر استعمال ہونے لگا جو پھر آگے چل کر علی العموم الحاد اور بددینی کے معنوں میں بولا جانے لگا۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "تین آدمی تین نتائج سے نہیں بچ سکتے۔ جو آدمی نجوم کو طلب کرے گا وہ زندقہ سے نہیں بچ سکتا۔ جو کیمیا کو طلب کرے گا وہ فقر و فاقہ سے نہیں بچ سکتا اور جو عجیب و غریب حدیثوں کی جستجو میں لگا رہے گا۔ وہ جھوٹ بولنے سے نہیں بچ سکتا۔"[2]

---

(۱) ملاحظہ ہو براؤن (۲) العقد الفرید ص ۱۹۹

(ج) مزدک

۴۸۷ء کے لگ بھگ ایران میں مزدک کا ظہور ہوا۔ طبری کا بیان ہے کہ "یہ اہل نیشاپور میں سے تھا۔ اس نے لوگوں کو ایک نئے ثنوی مذہب کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی نور اور ظلمت کا قائل تھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا امتیاز اس کی اشتراکی تعلیمات تھیں۔ مزدک کا خیال تھا کہ تمام انسان یکساں پیدا ہوتے ہیں انھیں یکساں طور پر ہی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ جن چیزوں میں مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے وہ مال اور عورتیں ہیں۔" شہرستانی نے کہا ہے کہ مزدک لوگوں کو اس سے منع کرتا تھا کہ ایک دوسرے کی مخالفت کریں، ایک دوسرے سے بغض رکھیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ چونکہ یہ چیزیں زیادہ تر عورتوں اور مالوں کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھیں اس لئے اس نے عورتوں کو اور اموال کو مباحات میں سے کر دیا۔ اور پورے معاشرے کو اس میں شریک ٹھہرا دیا۔ جیسا کہ پانی، آگ، گھاس اور چارہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ سب لوگ ان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ امام طبری نے یہ بھی کہا کہ مزدک اور اس کے اصحاب کہا کرتے تھے کہ خدا نے زمین میں رزق اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ بندے اسے آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں۔ لیکن لوگوں نے اس کی تقسیم میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مالداروں اور امیر لوگوں سے غریب لوگوں اور فقیروں کے لئے لے سکتے ہیں۔ جس شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ اموال، عورتیں اور اسباب معیشت ہوں اسے ان چیزوں کا دوسرے سے زیادہ کوئی استحقاق حاصل نہیں ہے۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے ان تعلیمات کو غنیمت تصور کیا اور مزدک اور اس کے اصحاب کے گرد جمع ہو گئے۔ اور ان کی تائید شروع کر دی عام لوگ سخت ابتلا میں گرفتار ہو گئے۔ ان لوگوں کی قوت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے گھس جاتے اور اس کے مکان، عورتوں اور اموال پر قبضہ کر لیتے۔ انھوں نے قباذ (شہنشاہ ایران) کو بھی پھسلانے کی کوشش کی اور اسے سبز باغ دکھائے بلکہ دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اسے تخت سے اتار دیں گے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ نہ آدمی اپنے بچوں کو پہچانتا تھا اور نہ اولاد اپنے باپ کو۔ کسی کے پاس اتنا نہ تھا کہ فراخی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔" امام طبری ہی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "مزدک نے جس چیز کو بڑا ہی خوشنما بنایا اور لوگوں کو برانگیختہ کر کے جس چیز کا حکم دیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے اموال میں اور عورتوں میں مساوات اختیار کریں۔ وہ کہتا تھا کہ یہی وہ نیک عمل ہے جسے خدا پسند کرتا ہے اور جس پر بہترین ثواب عطا کرتا ہے۔ اگر یہ چیز جس کا وہ لوگوں کو حکم دے رہا تھا اور جس پر لوگوں کو برانگیختہ کر رہا تھا۔ اس کا دین اور نظام کا جزو نہ ہوتی۔ تو یقیناً عملی طور پر یہ مساوات باعث شرف انسانیت اور ذریعہ امن و سلامتی بن جاتی۔" الخ [1]

سطور بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ مزدک کی اشتراکی تعلیمات دنیا کی اشتراکی تعلیمات میں سب سے سابق ترین ہیں[2]۔ پروفیسر نولڈکہ کہتے ہیں کہ جو چیز مزدک کی اشتراکیت کو جدید اشتراکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ صرف اس کی تعلیمات کا دینی رنگ میں رنگا ہوا ہونا تھا۔" اس کے علاوہ مزدک کی کچھ دوسری روحانی تعلیمات بھی تھیں چنانچہ وہ قناعت اور زہد کی تعلیم دیتا تھا۔ اور جانوروں کی حرمت کا قائل تھا۔ یعنی جانوروں کو ذبح کرنے سے منع کرتا تھا۔

---

[1] تاریخ طبری ص۸۸ ج ۲ وما بعد

[2] سابق ترین کہنا صحیح نہیں۔ سب سے پہلے اس کا تصور افلاطون نے پیش کیا تھا۔ (طلوع اسلام)

ہزار ہا لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ لیکن بالآخر قباذ (شہنشاہ ایران) نے اسے اور اس کی قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس نے ۵۲۳ء میں ان لوگوں کے لئے خفیہ تدبیر سے ایک قتل عام کرایا اور قریب قریب ان کی بیخ کنی ہی کر ڈالی۔

تاہم کچھ لوگ اس کے مذہب کی پیروی کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی ان کے متبعین کا نام ونشان ملتا ہے۔ اصطخری اور ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ کرمان کے بعض دیہات کے باشندے اموی دور حکومت کے آخر تک مزدکیت کے پیروکار چلے آتے تھے۔

صرف مالی جہت کی حد تک ہمیں ابوذر غفاریؓ اور مزدک کی رائے کے درمیان بہت بڑی مشابہت نظر آتی ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ شام میں کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ اے مالداروں کی جماعت! ضرورت مندوں کی خبر گیری کرو خدا کا ارشاد ہے کہ جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے کھلا نہیں چھوڑتے تم انھیں آگ کے بنے ہوئے ان اوزاروں کی خوشخبری دو جن سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر داغ لگائے جائیں گے۔ ابوذر غفاریؓ کی یہی روش رہی حتیٰ کہ فقراء ان باتوں سے ان کے فریفتہ ہو گئے اور انھوں نے ابوذر غفاریؓ کو مالداروں کے خلاف اور بھی بھڑکا دیا۔ حتیٰ کہ مالداروں کو ایذائیں پہنچنے لگیں اور یہ عام لوگوں کی شکایتیں کرنے لگے: پھر معاویہؓ نے ان کو حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس مدینہ میں بھیج دیا تاکہ ابوذرؓ کہیں معاویہ کے خلاف اہل شام کو خراب نہ کر دیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے ملک شام والے تمہاری زبان درازی کی بہت شکایتیں کرتے ہیں؟ تو ابوذرؓ نے فرمایا کہ مالداروں کو مال جمع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت ابوذرؓ کی رائے اموال کے بارے میں مزدک کی رائے سے کس قدر قریب تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ تک یہ رائے کس راہ سے پہنچی؟ امام طبری ہمیں اس سوال کا جواب بھی مہیا کر دیتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ابن السوداء، ابوذر غفاریؓ سے ملا اور اس نے انھیں ورغلایا۔ اور یہ ابن السوداء حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عبادۃ ابن الصامت کے پاس بھی پہنچا تھا۔ مگر ان دونوں نے اس کی بات نہیں سنی تھی بلکہ حضرت عبادۃؓ تو اسے پکڑ کر حضرت معاویہؓ کے پاس بھی لے گئے تھے! اور ان سے کہا تھا کہ خدا کی قسم یہی وہ شخص ہے جس نے ابوذر غفاریؓ کو تمہارے خلاف بھڑکا دیا ہے[1]۔ ہمیں معلوم ہے کہ ابن السوداءؓ دراصل عبداللہ بن سباء کا لقب ہے جس سے وہ مشہور تھا۔ یہ صنعاء کا ایک یہودی تھا جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں بظاہر مسلمان ہو گیا تھا اس کی اسکیم ہی یہ تھی کہ مسلمانوں کا دین خراب کر دے۔ اس نے مختلف شہروں میں ایسے بہت سے عقیدے پھیلا دیئے تھے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ضرر رساں تھے۔ ان چیزوں سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے یہ شخص بہت سے مرکزی شہروں میں گھوما، حجاز، بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں رہا۔ قرین قیاس ہے کہ اس نے اس نظریہ کو عراق یا یمن کی مزدکیت سے لیا ہو۔ اور اسے اپنے اس زہد کے رنگ میں رنگ لیا ہو جس کی طرف ان کی طبیعت پہلے ہی سے جھکاؤ رکھتی تھی۔ کیونکہ بہرحال حضرت ابوذرؓ غفاری نہایت متقی، پرہیزگار اور زاہد و مرتاض آدمی تھے اور ان محبوب شخصیتوں میں سے تھے۔ جنھوں نے صوفیہ پر بڑا ہی گہرا اثر ڈالا ہے[2]۔

۱۔ طبری ص۶۶ ج ۵ وما بعد۔

۲۔ سرمایہ داری کے زمانہ میں مرتب کردہ تاریخ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے خیالات کی سراغ رسانی کے لئے مزدک تک پہنچتی ہے۔ اسے قرآن کی تعلیم قطعاً نظر نہیں آتی جو سرمایہ داری کے لئے پیام مرگ تھی۔ (طلوع اسلام)

جن چیزوں کا تعلق ایرانیوں کے دینی عقائد سے ہے اور جنہوں نے مسلمانوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے ان میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ اہلِ ایران اپنے بادشاہوں کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے گویا وہ الوہیاتی کائنات ہیں جنھیں خدا نے اس لئے منتخب فرمایا ہے کہ وہ لوگوں پر حکومت کریں۔ خدا نے انھیں سرداری کے لئے خاص طور پر برگزیدہ کرلیا ہے اور وہ اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعہ سے ان کی تائید فرماتا ہے۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا سایہ اور ظل ہیں جنھیں خدا نے اپنے بندوں کی مصلحت کی خاطر پیدا کیا ہے لوگوں کے ان پر کوئی حقوق نہیں ہوتے البتہ بادشاہوں کا یہ حق لوگوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ان کی پوری پوری اطاعت اور فرمانبرداری کریں ــــ یہی وہ مفہوم ہے جو یورپ میں حق الٰہی (یعنی DIVINE RIGHT) کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی سیادت سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں قائم تھی۔ پروفیسر براؤن کہتے ہیں کہ حق الٰہی کا یہ نظریہ اس شدت کے ساتھ کبھی مقبول نہیں رہا۔ جس شدت کے ساتھ ساسانی شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں مقبول رہا ہے: اکاسرہ کا یہی خیال تھا کہ تنہا ان کو ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ شاہی تاج پہن سکیں۔ کیونکہ ان کی رگوں میں خدائی خون دوڑ رہا ہے ــــ پروفیسر نولڈکے نے ایرانیوں میں اس عقیدہ کی مقبولیت پر ایک حکایت سے استدلال کیا ہے جو "الاخبار الطوال" میں مذکور ہوئی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ بہرام چوبین ــــ یہ شاہی خاندان سے نہیں تھا اسے حکومت کی خواہش ہوئی اور اس نے کسریٰ پرویز سے جنگ کی۔ مگر کسریٰ نے اس کو شکست دیدی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا ــــ اپنے راستہ میں ایک گاؤں پر سے گذرا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس گاؤں میں قیام کیا۔ اور ایک بڑھیا کے گھر میں فروکش ہوا۔ انھوں نے اپنا کھانا نکالا اور شام کا کھانا کھالیا۔ اور اپنا پس خوردہ اس بڑھیا کو دیدیا پھر ان لوگوں نے شراب نکالی۔ بہرام نے اس بڑھیا سے پوچھا تمہارے ہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں ہم شراب پی لیں؟ بڑھیا نے کہا کہ میرے پاس ایک چھوٹا سا کدو ہے۔ چنانچہ اس نے وہ کدو ان کو لادیا ان لوگوں نے اس کا سر کاٹ کر (اندر سے گودہ صاف کرکے) اس میں شراب پینی شروع کردی۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ نُقْل نکالا اور بڑھیا سے کہا کہ کوئی ایسی چیز تو لاؤ جس پر ہم یہ نُقْل رکھ لیں۔ بڑھیا گھر میں سے چھلنی لے آئی۔ انھوں نے اپنا نُقل اس چھلنی پر ہی ڈال لیا اور کھانے لگے۔ بہرام کے حکم پر بڑھیا کو بھی شراب پلائی گئی۔ کچھ دیر کے بعد بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ "بڑی بی! تمہارے پاس کوئی نئی خبر بھی ہے؟ بڑھیا نے کہا ہاں خبر تو یہی ہے کہ کسریٰ روم سے فوج لے کر آگیا ہے: اور اس نے بہرام سے جنگ کرکے اسے بھگادیا ہے اور اپنا ملک اس سے واپس لے لیا ہے۔ بہرام نے پوچھا کہ "بہرام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کیسا آدمی ہے؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ "نرا جاہل اور بیوقوف ہے۔ شاہی خاندان سے تو ہے نہیں اور چلا ہے حکومت کا دعویٰ کرنے"! بہرام نے کہا کہ "جبھی تو وہ کدو میں شراب پیتا اور چھلنی میں نُقل کھاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اہلِ ایران میں ضرب المثل بن گئی:

ہماری رائے میں یہ استدلال کچھ زیادہ قوی نہیں۔ کیونکہ ہر صاحب حکومت خاندان جسے حکومت کرتے کئی پشتیں گذر جائیں تو عام لوگوں کی نگاہوں میں اس خاندان کا یہ الٰہی حق قائم ہوجاتا ہے۔ اور یہ کچھ ایرانیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم کا یہی حال ہے اگرچہ وہ اپنے بادشاہوں کی تقدیس کے قائل نہ بھی ہوں۔

ہمارے خیال میں اس رائے کی تائید میں کتاب التاج کا وہ بیان اس سے کہیں بہتر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ رعایا کو کبھی یہ جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ساسانی خاندان کے بادشاہوں کی کنیت یا نام

لے سکیں۔ حتیٰ کہ اشعار میں، خطبوں میں، تقریظ و مدح میں اور نہ اور کسی تقریب میں بادشاہوں کا نام قطعاً نہیں لیا جاتا تھا۔ الغرض بادشاہوں کا نام لینا شاہان حیرہ میں پیدا ہوگیا تھا۔

اس سے یہ چیز ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ بادشاہ اپنے آپ کو کس قدر اونچا سمجھتے تھے۔ اور ان کی قوم ان کو کس قدر بلند مرتبہ خیال کرتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ چیز انتہائی بے ادبی شمار ہوتی تھی کہ لوگوں کی زبان پر ان کا نام یا کنیت آ جائے۔ حتیٰ کہ اشعار تک میں بھی اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یہ تھے ایران کے دینی مذاہب جو فتوحات کے بعد اسلامی مملکت میں گھل مل گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان تو ہو گئے مگر اپنے ان تمام عقائد و خیالات سے بیگانہ نہیں بن سکے جو پشتہا پشت سے ان میں چلے آ رہے تھے۔ زمانہ جوں جوں گذرتا گیا وہ اپنے پرانے افکار و نظریات کو اسلام کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔

غور کیجئے تو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں شیعوں کا نظریہ بعینہٖ وہی نظریہ ہے جو ان کے اگلے آباد و اجداد کا نظریہ ساسانی شہنشاہوں کے بارے میں ہوا کرتا تھا۔ ایران کی ثنویت ہی وہ سرچشمہ تھی جس سے اسلام میں فرقۂ رافضہ نے سیرابی حاصل کی۔ اسی چیز نے معتزلہ میں حرکت پیدا کی۔ اور بالآخر وہ رافضہ اور اُن جیسے دوسرے فرقوں کے دلائل کے ابطال پر کمر بستہ ہوئے۔ اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ زردشت۔ مانی اور مزدک کی تعلیمات مسلمانوں کے درمیان تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مختلف صورتوں میں ابھر سر نکالتی رہیں۔ چنانچہ اموی دور حکومت کا آخری حصہ اور دولت عباسیہ کا پورا دور اسی کی ایک رنگین داستان ہے۔ جس پر مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ان لوگوں سے مناظرے کریں۔ اور ان کے دلائل کا ابطال کریں۔ اور منطق اور برہان سے اپنے دین کی تائید کریں۔

ان لوگوں کی طرف سے آئے دن جو نت نئے مسائل پیدا کئے جاتے تھے۔ وہ بسا اوقات خود مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس طرح وہ مختلف مذہبوں میں بٹ جاتے۔ اور آپس میں ہی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے تھے۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی جو اسلام میں علم کلام کی پیدائش اور نشو و نما کا باعث ہوئی۔ مگر یہ ایک مستقل باب ہے جسے ہم آئندہ کسی موقعہ پر بیان کریں گے۔

تاریخ الامت

از علامہ اسلم جیراجپوری ؒ

تاریخ کی وہ بیمثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مصنف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت حصہ اول حصہ سوم دو روپے فی حصہ

حصہ دوم و چہارم دو روپے آٹھ آنے فی حصہ

کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائینگے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

ایل ۱۵۹/۳۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی

حقائق و عبر

تنسیخ زمینداری

مشرقی بنگال میں آجکل تنسیخ زمینداری کا ہنگامہ برپا ہے اور ہائیکورٹ میں حکومت کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنیکے علاوہ اس کے خلاف زمینداروں اور ان کی بیگمات کی طرف سے احتجاجی جلوس بھی نکالے جا رہے ہیں اس ہنگامہ آرائی پر تبصرہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کا آرگن معزز معاصر روزنامہ ایشیا لاہور رقمطراز ہے۔

> معاملہ اب ہائیکورٹ کے سامنے ہے اور وہی فیصلہ کرے گا کہ فرمانِ گورنر اسلام کے اصولوں اور پاکستان کے آئین و دستور کے تقاضوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور پھر ہر چند زمینداروں کی یہ اسلام پسندی اور دین داری غیر اسلام پسندانہ اور غیر دیندارانہ ذہن پر مبنی ہے۔ تاہم چونکہ ہمارا آئین اسلام کی پیروی کا عہد کر چکا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اسلام کے اصولوں کا بے لاگ اطلاق کیا جائے۔ اور جن زمینداریوں کو ضبط کیا جائے اسلام کے دیئے ہوئے حق کی بنا پر کیا جائے۔ اس صورت میں مناسب ہوگا کہ بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہ رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ بعض لوگ موجودہ عہد کے زمینداروں اور ان کی زمینداریوں کے حالات سے گھبرا کر یہ چاہتے ہیں کہ ان کو بے تحاشا ضبط کر لیا جائے اور اسلام کو معیار فیصلہ نہ بنایا جائے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اسلام سے رجوع کیا گیا تو حق ملکیت کے اصول کی بنا پر شاید زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہ ہوگی۔ لیکن ان کا یہ اندیشہ بالکل باطل ہے۔ اسلام کسی غلط جابرانہ، ناجائز اور مخالفانہ حق ملکیت کو برقرار نہیں رہنے دیتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر ان کو ختم کرتا ہے اور غیر اسلامی فلسفے ان کو بے قاعدہ طور پر۔ الخ (ایشیا مورخہ ۲۵ر اپریل ۱۹۵۶ء)

مندرجہ بالا اقتباس میں خط کشیدہ عبارت کو ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھ لیجئے۔ اور ان نکات کو ذہن میں رکھیے کہ مدیر کے نزدیک

(۱) اسلام نے زمینداریوں کو ضبط کرنے کا حق دیا ہے۔ اور

(۲) اس میں بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہیں رہتا

(۳) جن لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کو معیار فیصلہ بنا کر زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہیں ہو سکیگی، ان کا یہ اندیشہ بالکل

باطل ہے۔

(۴) اسلام زمینداریوں کو باقاعدگی کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ جب کہ غیر اسلامی معاشی فلسفے انھیں بے قاعدہ طور پر ختم کرتے ہیں

ہمارا خیال ہے کہ (محترم مدیر الیشیا) نے سطور بالا کو حوالۂ قلم کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے موقف کو ذہن میں نہیں رکھا جس کی توضیح جماعت اسلامی کے امیر محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں اس طرح فرمائی ہے

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو۔ تو ایسی تمام چیزوں کو پہلے قدم پر ہی لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔ جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت بھی نہیں دیتا جن کے ذریعہ کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔۔۔۔ اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کرسکتے ہیں۔ اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی، اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت، صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے براہ راست تم خود کرو۔ اور جس طرح اس نے دولت کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے۔ جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعہ کرا سکتے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

(مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۷۰-۷۳)

لہٰذا مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تصور بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے اور

(۲) اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ

(۳) وہ ایسے قوانین بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔

مگر مدیر ایشیا کے نزدیک اسلام نے زمینداریوں کو ضبط کرنے کا حق دیا ہے اور اس میں بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ ان کے نزدیک جو اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ اسلام کو معیار فیصلہ بنا کر زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہ ہوسکیگی۔ ان کا اندیشہ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ اسلام تو خود زمینداریوں کو ختم کرتا ہے اور باقاعدگی کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کے ماتحت جماعت اسلامی نے اب اپنی پالیسی میں تبدیلی کرلی ہو جس کے ماتحت مدیر ایشیا نے تنسیخ زمینداری کو عین اسلام کے مطابق قرار دیا ہے جبکہ ان سے پہلے ان کے امیر اسے اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد قرار دے چکے تھے۔ اگر ایسا ہے تو بات صاف ہوجانی چاہیئے تاکہ قارئین تشتت فکر و نظر کا شکار نہ ہوں اور وہ جماعت اسلامی کے موقف کو صحیح طور پر سمجھ سکیں کیا ہم محترم نصر اللہ خاں عزیز صاحب سے یہ امید کریں کہ وہ اس امر کو واضح فرمادیں گے۔

اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل

معزز معاصر ایشیا مورخہ ۵ مئی ۱۹۵۶ء اپنے ایک ایڈیٹوریل نوٹ میں رقمطراز ہے کہ

"سننے میں آیا ہے کہ شاہ ایران ملکہ ثریا کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ طلاق کی یہ وجہ نہ اسلامی ہے نہ اخلاقی۔ اول تو یہ کیا ضرورت ہے کہ شاہ ایران کا ولی عہد ضرور ہی ان کی اولاد میں سے کوئی بچہ ہو۔ تخت و تاج اگر کسی دوسرے شخص کے حصہ میں آتا ہے تو شاہ ایران کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ دوسرے اگر اس ملکہ کے بطن سے اولاد نہیں ہوئی۔ اور ثابت ہوچکا ہے کہ وہ بانجھ ہیں تو شاہ دوسری عورت سے شادی کرسکتے ہیں۔ وہ بہرحال مسلمان ہیں۔ نہ عیسائی ہیں۔ اور نہ یورپین۔ اسلام کا یہی تو احسان ہے انسانیت پر کہ وہ اس کی مشکلات کا ازالہ کرنے کی تدابیر پہلے سے کتاب قانون میں رکھ دیتا ہے۔ تعدد ازدواج کی اجازت کی ایک وجہ یہ ہے کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کے دلائل خود انسانی زندگی کے نمایاں اتفاقات سے پیش فرماتی رہتی ہے۔"

جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ شاہ ایران کو اس پر اعتراض کا حق ہے یا نہیں کہ تاج و تخت ان کی اولاد کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے حصہ میں کیوں آتا ہے۔ اس کا جواب تو شاید شاہ ایران خود ہی دے سکیں۔ ہمارے لئے قابل غور وہ مذکورہ کرشمہ ہے جس کے ذریعہ خدا نے اسلام کی حقانیت کی یہ مزعومہ دلیل مہیا فرمائی ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت اس نے کتاب قانون میں رکھی ہی اس لئے تھی کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ جہاں تک ہم نے قرآن پر غور کیا ہے ہمیں بجز ایسے ہنگامی حالات کے جن میں بیوہ اور یتیم لڑکیوں کے ساتھ اس کے بغیر عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکتا ہو۔ دوسری کسی حالت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ملتی۔ معلوم نہیں محترم مدیر ایشیا نے یہ وجہ کہاں سے نکالی ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت کی ایک وجہ یہ ہے کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ قانون (کتاب) اور اس کی حکمت (وجہ اور علت) دونوں منزل من اللہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ (۴/۱۱۳)

اور خدا نے اے پیغمبر اسلام تم پر کتاب اور حکمت (دونوں) نازل کی ہیں اور بہتیں وہ چیزیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور خدا کا تم پر بڑا فضل رہا ہے۔

ہمیں قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی اجازت کی یہ حکمت (وجہ اور علت) کہیں نظر نہیں آئی کہ ایسا کرنے سے بانجھ عورتیں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہو سکیں گی۔ قرآن تو قرآن ہے۔ تعدد ازدواج کی یہ مصلحت تو ہمیں حدیث کی کسی روایت میں بھی نظر نہیں آسکی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہؓ میں سے کسی نے اس مقصد سے کبھی دوسری شادی نہیں کی کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔

اگر اسلام کی حقانیت کے ایسے ایسے خود ساختہ دلائل (خدا کی قدرت کاملہ کا کرشمہ نہیں) جماعت اسلامی کے ائمہ پیش فرماتے رہے تو اس دین کا اللہ حافظ ہے۔

اخلاقی جرأت کا نمونہ

معاصر "المنیر" کے ایک مقالہ بعنوان "تحلیل و تجزیہ" کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

"المنیر" ۳ جنوری ۵۵ء میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے "طلوع اسلام" کے ایک مضمون کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

طلوع اسلام اپنی اشاعت مورخہ ۵ جون ۵۵ء میں لکھتا ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک دین کے ہر معاملہ میں سندان کے امیر مودودی صاحب ہیں۔ چنانچہ جب وہ جہاد کشمیر کے سلسلہ میں قید ہوئے تو اس جماعت کے قیم محترم طفیل محمد صاحب نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک جانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں (قاصد کشمیر بجواب الفرقان بابت مئی جون ۵۵ء)

قیم جماعت اسلامی کی طرف منسوب کردہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ احتیاطاً الفرقان لکھنؤ بابت ماہ مئی جون بھی دیکھا گیا۔ لیکن اس میں بھی یہ حوالہ نہیں ملا۔

نہ معلوم الفرقان سے کون سا الفرقان مراد ہے۔ بہرحال طفیل محمد صاحب نے اس قسم کی عبارت قاصد کشمیر نمبر تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے۔ اور نہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن اس نظریہ کا قائل ہے۔ کیا ادارۂ طلوع اسلام اس کا صحیح حوالہ دے سکتا ہے؟ اور اگر یہ الزام غلط ہے (اور واقعتہً غلط ہی ہے) تو کیا اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے

الفرقان (ربوہ) نے اپنی اشاعت جنوری ۵۶ء میں لکھا۔

ہمیں حیرت ہے کہ اتنے بڑے مولانا صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ رسالہ الفرقان ربوہ سے شائع ہوتا ہے۔ حالانکہ المنیر میں اس الفرقان کا متعدد مرتبہ ذکر آچکا ہے۔ مولانا حسن صاحب اور دیگر اسلامی جماعت کے اراکین کی آگاہی کے لئے عرض ہے کہ یہ حوالہ اخبار طلوع اسلام کراچی نے الفرقان ربوہ بابت مئی جون ۵۵ء یعنی جماعت اسلامی نمبر ص۹۱ سے نقل کیا ہے جسے ہمارے فاضل نامہ نگار دوست محمد صاحب شاہد نے پیش کیا تھا۔

یہ حوالہ میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت کے مضمون مسئلہ کشمیر اور جماعت اسلامی: میں موجود ہے۔ روزنامہ قاصد لاہور کے کشمیر نمبر مورخہ ۱۸ ستمبر ۵۰ء پر یہ الفاظ ہیں۔

پاکستان، ہندوستان، آزاد قبائل اور کشمیر ہر جگہ کے لوگوں کے نزدیک مولانا (ابوالاعلیٰ صاحب) اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں۔

اخبار قاصد کا کشمیر نمبر ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر جناب اڈیٹر صاحب المنیر چاہیں تو انہیں دکھا سکتے ہیں۔ مولانا حسن صاحب اب کیا فرماتے ہیں؟ ان دنوں ہم نے قاصد کا کشمیر نمبر تلاش کیا۔ لیکن سعی لاحاصل کے باوجود ہمیں یہ پرچہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب گذشتہ ہفتہ ہمیں اس نمبر کی ایک کاپی مل گئی ہے۔ ہم نے اس حوالے کو تلاش کیا۔ حسب ذیل الفاظ ملے۔

پاکستان، ہندوستان، آزاد قبائل اور کشمیر ہر جگہ کے لوگوں کے نزدیک مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں۔ (قاصد کشمیر نمبر ص۱۷)

المنیر کی گذشتہ دو سالہ زندگی شاہد ہے کہ ہم نے ہر مسئلہ میں اس بات کی تائید کی ہے جسے ہم اپنی تحقیق کی حد تک حق و صواب جانتے ہیں۔ اور ہر اس چیز کی تردید کی ہے جو ہمارے علم میں خدا، رسول اور اسلام کی منشا کے مطابق نہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنا ہمارے اولین فرائض دینیہ میں شامل تھا اور ہے

البتہ ہم اس امر کے قائل نہیں کہ ہمارا اہتمام ہر وقت صرف اسی کام میں صرف ہو کہ کس صاحب قلم اور صاحب علم نے کہاں کیا لکھا ہے۔ اور اس سے اس میں کیا چوک ہوئی ہے۔ اور جونہی ہمارے علم میں کسی کی کوئی غلطی آئے، ہم سب کام کاج چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائیں۔ یہ کام تو ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مصرف یہی سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی فروگذاشتوں اور غلطیوں کا تذکرہ کر کے اپنی دکان تنقید کو چلائیں اور جن کا فکر اہم یہ ہو کہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لیا جائے۔ اور اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ ٹوہ لگائی جائے کہ خطا و نسیان کہاں کہاں سرزد ہوا۔ ان کے لئے ممکن نہیں کہ ایسا کر سکیں۔

بہر نوع ہم اپنا دینی اور اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ جب ہمیں یہ الفاظ قاصد کشمیر نمبر میں مل گئے تو سب سے پہلے طلوع اسلام اور الفرقان دونوں کو مطلع کریں کہ المنیر نے (مولانا غفار حسن صاحب کے مضمون کے توسط سے) جو اظہار خیال کیا تھا۔ اگرچہ اس کا انداز استفہامیہ تھا تاہم حوالہ مل چکا ہے اور طلوع اسلام اور الفرقان دونوں نے اس حوالہ میں نہ خیانت کی ہے۔ نہ غلط بیانی۔

ہم معزز معاصر کی اس نیم اخلاقی جرأت پر بھی اسے مبارکباد دیتے ہیں کہ ہمیشہ کی طرح اس نے اس معاملہ میں چپ نہیں سادھی بلکہ اس کا اعتراف کر لیا کہ ہم نے حوالہ میں نہ کوئی خیانت کی تھی اور نہ کوئی غلط بیانی۔ لیکن اچھا ہوتا کہ اخلاقی جرأت کا ثبوت پورے طور پہ دیا جاتا اور یہ بھی اعتراف کر لیا جاتا کہ جب جنوری ۵۶ء میں یہ لکھا گیا تھا کہ

قیم جماعت اسلامی کی طرف منسوب کردہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔

تو اس وقت کھلی غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت قاصد کشمیر نمبر میں محولہ عبارت کو تلاش کرنا تو کجا خود ان کے اعتراف کے مطابق

ان دنوں ہم نے قاصد کا کشمیر نمبر تلاش کیا۔ لیکن سعی بسیار کے باوجود ہمیں یہ پرچہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب گذشتہ ہفتہ ہمیں اس نمبر کی ایک کاپی مل گئی ہے۔

جب ان دونوں معاصر موصوف کو قاصد کا کشمیر نمبر سعی بسیار کے باوجود دستیاب ہی نہیں ہو سکا تھا تو پھر یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ "محولہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی"۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہاں تک تحدی کے ساتھ لکھا گیا کہ

بہرحال طفیل محمد صاحب کے اس قسم کی عبارت قاصد کشمیر نمبر تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے ...... اگر یہ الزام غلط ہے (اور واقعۃً غلط ہی ہے) تو کیا اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے۔

اس کے بجائے فاضل مدیر نے جو عذر گناہ پیش کیا ہے۔ وہ بدتر از گناہ کا نمونہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "البتہ ہم اس امر کے قائل نہیں کہ ہمارا اہتمام ہر وقت صرف اسی کام میں صرف ہو کہ کس صاحب قلم اور صاحب علم نے کہاں کیا لکھا ہے۔ اور اس میں اس سے کیا چوک ہوئی

ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غالباً وہ اس کے قائل ضرور ہیں کہ جب کوئی انھیں ان کی اپنی غلطی پر متنبہ کرے تو ڈھٹائی کے ساتھ اس سے مکر جائیں اور الٹا غلطی پر متنبہ کرنیوالے کو جھوٹا بنانے کے لئے زمین و آسمان ایک کردیں۔ اگر ان کا فکر اہم یہ ہوتا کہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لیا جائے اور اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ ٹوہ لگائی جائے کہ خطا و نسیان کہاں کہاں سرزد ہوا۔ تو ان کو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ ان کی جماعت کے تیمنے کہاں کیا غلطی کی تھی اور وہ اس سے اس ڈھٹائی کے ساتھ مکر جانے کی جرات نہ کرسکتے۔ پھر شاید معاصر موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ استفہامیہ انداز کسے کہتے ہیں۔ بہتر ہو کہ وہ استفہام اور استفہامیہ انداز کے متعلق خود ہی گرامر کی کسی کتاب میں دیکھ لیں انھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ استفہامیہ انداز کیا ہوتا ہے اور تحدی کا انداز کسے کہتے ہیں اس کے بعد معزز معاصر لکھتا ہے۔

> ہماری تحقیق اور رائے اس بارے میں وہی ہے جو المنیر ۳ جنوری ۱۹۵۵ء میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بجواب طلوع اسلام لکھی ہے کہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مولانا مودودی دین میں سند ہیں ...... جماعت اسلامی نے اس عقیدہ کو آئینی حیثیت دی ہے چنانچہ دستور جماعت میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ
>
> رسول خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو نہ کہ ان سے آزاد ...... اس اہم بات کو صرف فرض کی حد تک ہی قانونی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ ہر رکن شوریٰ کو اس امر کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ شوریٰ کے پہلے اجلاس میں ایک حلف اٹھائے جس میں یہ شق بھی شامل ہے۔
>
> میں ...... اللہ رب العالمین کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا (دستور ص ۵۹)

لیکن کون نہیں جانتا کہ کاغذ پر لکھی ہوئی ان دستوری دفعات کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی۔ جب کہ ان دفعات کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے ہر رکن کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ

(۱) رسول اللہ صلعم اور آپ کی سنت کی اطاعت اور وفاداری احادیث کی رو سے ہو سکتی ہے اور

(۲) احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں اور غلط حدیثیں بھی حتیٰ کہ صحیح بخاری تک میں غلط حدیثیں موجود ہیں۔ اور

(۳) اسے صرف مزاج شناس رسول ہی بتا سکتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں حدیث غلط ہے اور

(۴) بقول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب یہ مزاج شناس رسول سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔

کیا معاصر موصوف کو اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں رسول اللہ صلعم کی اطاعت و وفاداری کی حیثیت تو محض ایک نمائشی پردہ کی رہ جاتی ہے جس کی آڑ میں درحقیقت مزاج شناس رسول کی اطاعت اور وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے رسول اللہ صلعم کا نام تو محض برکت کے لئے یا جاہلوں کو فریب دینے کیلئے لے لیا جاتا ہے ورنہ دراصل دین کے ہر معاملہ میں سند مزاج شناس رسول ہی ٹھہر جاتا ہے۔ ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محترم طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی نے جماعت اسلامی کے عقیدہ کے تحت قاصد کشمیر نمبر پر جب مودودی صاحب کو دین کے ہر معاملہ میں سند قرار دیا تھا تو انھوں نے اپنے دل کی بات کہدی تھی۔ نہ صرف اپنے دل کی بات بلکہ پوری جماعت اسلامی کے دل کی بات۔

باب المراسلات

اعتکاف

کراچی سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

پچھلے دنوں نماز جمعہ کے سلسلہ میں ایک بڑے مولوی صاحب کے خطبہ کو سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے قرآن کریم سے اعتکاف کا حکم ثابت کیا اور بتایا کہ رمضان کے آخری دس دن کا اعتکاف کرنا بڑی ہی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے احکام انھوں نے کچھ ایسے انداز سے بیان کئے۔ جن سے خالص رہبانیت جھلکتی تھی کہ ایک آدمی کو کچھ عرصہ کے لئے دنیا و مافیہا سے کاٹ کر مسجد میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ہمہ وقت عبادت (پرستش) الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اسلام اور قرآن اس قسم کی رہبانیت کی تعلیم کیسے دے سکتے ہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے اپنی ان باتوں کے لئے قرآن کا نام لیا اور سورۂ بقرہ کی آیت

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ط

کا حوالہ دے کر اپنی ساری باتیں قرآن کے سر تھوپ دیں۔

کیا مہربانی فرما کر آپ بتائیں گے کہ قرآن کی رو سے اعتکاف کی کیا حقیقت ہے؟ اور محولہ بالا آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟

طلوع اسلام آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ اس قسم کا اعتکاف جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ جس میں اعتکاف کرنے والا کسی مسجد کے ایک کونہ میں چادر تان کر دس روز کے لئے آ کر پڑ رہتا ہے۔ اور دن رات قرآن کے الفاظ دہرانے یا سونے اور جوئیں مارنے کے اسے اور کوئی کام نہیں رہتا۔ وہ قطعاً غیر قرآنی ہے۔ اور اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کی رہبانیت یا پرستش کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے اعتکاف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "عاکفون" اور "عاکفین" کے لفظ قرآن کریم میں متعدد جگہ آئے ہیں جس کے معنے کسی کام پر مسلسل لگے رہنا اور جمے رہنا ہیں۔ کعبہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ طائفین اور عاکفین کے لئے ہے (۲/۱۲۵) وہاں عاکفین کے معنے ایسی جماعت کے ہیں جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انھیں ایک رشتہ میں پرو کر ان کے حالات کو درست رکھے۔ اور مسلسل اسی دھن میں لگی رہے۔

جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی مسلمانوں کو اعتکاف کرنے کا نہ کوئی حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی تفصیلات بیان کی گئی ہے۔ محولہ آیت میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے لئے جو عاکفون فی المساجد ہوں ایک ہدایت دی گئی ہے اور بس

عاکفون فی المساجد کے معنے ہیں — پابندی کے ساتھ مسجدوں میں رہنے والے۔ مسجدوں میں رک جانے والے۔ مسجدوں میں جم کر بیٹھنے والے — یہ عاکفون فی المساجد جن کا تذکرہ ضمناً روزوں کے احکام میں کیا گیا ہے، کون لوگ ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے مختصراً اتنی بات ذہن میں رکھئے کہ روزے دراصل مسلمانوں میں ضبطِ نفس اور قوتِ برداشت پیدا کرنے کا ایک ٹریننگ کورس ہیں، اور مسجدیں مسلمانوں کی حیاتِ ملی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزوں کے ضمن میں یہاں مساجد سے مفہوم ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ اس سالانہ ٹریننگ کورس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جن کو رات کے اوقات میں بھی کچھ ضروری امور کی تکمیل کے لئے ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں روک لیا جائے۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ اس ٹریننگ کورس میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں (یعنی عام روزہ دار) ان کو جہاں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دن بھر کھانے پینے اور اپنی بیویوں کے پاس جانے سے احتراز کریں وہیں اس کی اجازت بھی دیدی گئی تھی کہ رات کے اوقات میں (جبکہ روزہ نہیں ہوتا) یہ لوگ اپنی بیویوں کے پاس جاسکتے اور جنسی تمتع حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں کسی خاص ڈیوٹی پر لگایا گیا ہو اور رات کے اوقات میں انہیں ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپس میں روک لیا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کو رات کے اوقات بھی (عام روزہ داروں کے برعکس) اپنی بیویوں سے جدا رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ دس دن کی قید ہے اور نہ رمضان کے آخری دنوں کی۔ اس کا مدار نظام پر ہے کہ وہ آدمی کو رات کے اوقات میں کتنے روز یا کتنے وقت کیلئے ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں روکتا ہے۔ بہرحال جب تک یہ لوگ ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں رہیں گے انہیں اتنے عرصہ کیلئے جنسی تمتع سے محترز رہنا ہوگا۔ یہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب اور محل مگر چونکہ ہماری نگاہوں سے نظام اوجھل ہو چکا ہے اور تمام چیزیں رسمی پرستش کے طور پر کی جا رہی ہیں اس لئے اعتکاف بھی ایک رسمی پرستش کے طور پر ہمارے ہاں باقی رہ گیا ہے۔

سیکولر بھارت

بھارت سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کے پڑوس میں ایک ایسی حکومت ہے جو سیکولر ہونے کی مدعی ہے۔ لیکن ہر قدم پر مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتتی ہے مسلمانوں کو کوئی کلیدی ملازمت نہیں مل سکتی۔ ہر جگہ ہندو مسلم کا سوال ہے مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم ہے مسلمانوں کی نہ کوئی آواز ہے نہ قدر و قیمت آج تک چھوٹی سی چھوٹی ریاست کا وزیر اعلیٰ بھی کوئی غیر ہندو نہیں ہو سکا۔ صدر یا وزیر اعظم یا سپہ سالار کا ذکر ہی کیا ہے دکھانے کیلئے گورنر غیر ہندو ہو جاتا ہے کیونکہ گورنر کا عہدہ محض نمائشی ہے اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ براہ مہربانی وہاں کی ہندو پبلک سے اپنے پڑوس کی حکومت کے نام ایک درخواست دلوا دیجئے کہ وہ غیر ہندوؤں کے خلاف امتیاز نہ برتے اور ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرے۔

طلوعِ اسلام کیا ہمارے ارباب حکومت جنہیں مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا غم ہر وقت کھائے جاتا ہے۔ اور جو ان کے لئے اقلیتی کانفرنسیں منعقد کرتے نہیں تھکتے اس خط کے مندرجات پر متوجہ ہو سکیں گے اور کیا اس تلخ حقیقت پر غور کر سکیں گے کہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کیلئے بھی اس قسم کی کوئی اقلیتی کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت ہے جیسی وہ ہندوؤں کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم مشرقی پاکستان کے ہندوؤں سے بھی اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اس نامہ نگار کی خواہش کے مطابق وہ بھارت گورنمنٹ کو اس قسم کی درخواست بھیجنے کے لئے تیار ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا حیاسوز امتیاز نہ برتے اور ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرے۔

لمعات (صفحہ سے آگے)

نشوونما کے اسباب و ذرائع مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

(۸) وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں نہ رہنے دیئے جائیں۔ اور ہر شخص کی "جائداد" کی حد بندی کی جائے۔ موجودہ حالات میں دیانتداری اسی سے پیدا ہو سکے گی۔

(۹) تعمیرِ سیرت کے لئے قرآنی تعلیم کو دل کی گہرائیوں میں اتارا جائے اور رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کو جسے قرآن نے بیان کیا ہے "شمعِ راہ" بنایا جائے۔

(۱۰) قانون سازی کے سلسلہ میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے کہ کوئی قانون قرآنی اصولوں سے ٹکرائے نہیں۔

یہ ہے وہ طریقِ عمل جس سے ہم موجودہ جہنمی زندگی سے نکل سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں خدشہ ہے کہ ملک کمیونزم کے سیلاب میں بہہ جائیگا جس میں انسانیت کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔ اس خدشہ کی بنیاد یہ ہے کہ ملک کے عوام میں مفلسی اور ناداری کے ساتھ مایوسی عام ہو رہی ہے اور پڑھا لکھا نوجوان طبقہ ملک کے اس مذہبی تصور سے متنفر ہو چکا ہے جس کی بنا پر بدقسمتی سے ہمارے آئین کو اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن سے وہ خلا پیدا ہوتا ہے جسے پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا جھکڑ آیا کرتا ہے۔ کیا اربابِ لیگ ہماری اس مخلصانہ گذارش پر غور کریں گے؟

پاک جنرل بوٹ فیکٹری کے تیار کردہ جوتے

اسٹاکسٹ جنرل بوٹ ہاؤس الفنسٹن اسٹریٹ۔ کراچی فون نمبر ۶۴۳۸